سلسلہ مفت اشاعت نمبر 104

وسیلہ
نسبت
تعظیم

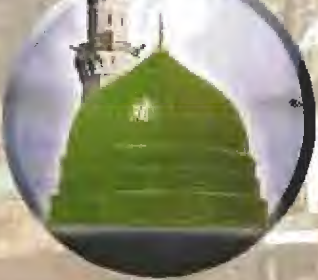

مُصنّف:
علامہ مشتاق احمد نظامی
علیہ الرحمۃ

جمعیت
اشاعت
اہلسنت
پاکستان

نور مسجد کاغذی بازار میٹھادر کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلَیکَ یا رَسُولَ اللّٰہ ﷺ

نام کتاب	:	وسیلہ، نسبت، تعظیم
مصنف	:	حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ
ضخامت	:	۴۸ صفحات
تعداد	:	۲۰۰۰
سن اشاعت	:	ستمبر 2002ء
مفت سلسلہ اشاعت	:	۱۰۴

☆☆ ناشر ☆☆

جمعیت اشاعت اہلسنّت پاکستان

نور مسجد کاغذی بازار، میٹھادر، کراچی۔ 74000 فون: 2439799

زیرِ نظر کتابچہ جمعیت اشاعت اہلسنّت پاکستان کے اشاعتی سلسلے کی 104 ویں کڑی ہے اس رسالہ میں دو مضامین شامل اشاعت ہیں پہلا مضمون "وسیلہ، نسبت، تعظیم" کے نام سے ہے جسے تحریر کرنے والے خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی صاحب علیہ الرحمہ ہیں جبکہ دوسرا مضمون اسی موضوع پر محترم جناب زاہد الکوثری صاحب کا ہے دونوں مضامین اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ قارئین کرام کے علمی ذوق پر پورا اتریں گے۔

فقط

ادارہ

وسیلہ.........نسبت.........تعظیم

مَآ اٰتٰکُمَ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَ مَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (القرآن)

رسول اللہ جو عطا فرمائیں اسے لے لو اور جن چیزوں سے روک دیں اُن سے رک جاؤ۔

کچھ نام نہاد مدعیانِ اسلام کا یہ کھوکھلا نعرہ ہے کہ ہمیں جو لینا ہوگا خدا سے لیں گے اور خدا یہ فرماتا ہے کہ تمہیں وہی لینا پڑے گا جو میرے مصطفیٰ تمہیں دیں گے۔

گویا جو آیت میں نے پیش کی ہے وہ ان کی برہنہ پشت پر تازیانہ عبرت اور مکروہ چہرے پر غیبی طمانچہ ہے۔

معلوم ہوا کہ میرے سرکار خدا اور بندوں کے درمیان ایک وسیلہ ہیں اسی کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

خدائے قدیر ارشاد فرماتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:۔

"میرے مصطفیٰ جو کچھ تم لوگوں کو دیں اسے لے لو اور جن چیزوں سے روک دیں اُن سے رک جاؤ"۔

کہنے کے لیے بظاہر یہ کتاب اللہ کا ایک مختصر سا ٹکڑا ہے لیکن خداوند قدوس نے اسی مختصر سے ٹکڑے میں ہمارے قانون زندگی کو سمو دیا ہے اور اسی اتنے ہی حصے میں ہمارے دستور حیات کو سمیٹ دیا ہے۔

یہ انسانی کتاب نہیں آسمانی اور منزل من السماء کتاب ہے۔ اس میں امثال و نظائر کا پھیلاؤ بھی ہے اور قانون کا ایجاز و اختصار بھی۔ ویسے ہم اور آپ بھی کسی کی تعریف میں بولتے ہیں کہ فلاں خطیب کا کیا کہنا، ایسا جادو بیان مقرر کہ اس نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا، لیکن یہ اردو زبان کی کہاوت اور ضرب المثل ہے مگر میں نے جو آیتِ پیش کی ہے وہ اس کہاوت کی منہ بولتی مثال ہے۔ ہم اس کی تفصیل آگے عرض کریں گے سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کر لیجئے کہ میرے مصطفیٰ جو دیں اسے ہم لے لیں اور وہ جن چیزوں سے روک دیں ہم اُن سے رک جائیں۔

اگر مسلمانوں کو یہ قانون یاد رہ جائے تو اس کا قدم کبھی ڈگمگا نہیں سکتا، نہ ہی وہ پھسلے اور

نہ ہی وہ گرے۔ مثلاً اگر وہ کسی چیز کو پینا چاہتا ہے اور ہونٹوں کے قریب آتے آتے اسے یاد آ جائے کہ میں اسے پینے تو جا رہا ہوں، کہیں رسول خدا نے اسے حرام تو نہیں فرمایا......؟ اب اسے وہ پی نہیں سکتا، اس کا ضمیر نفرت و ملامت کرے گا، ہاتھوں سے پھینک دے گا، اگر وہ کسی چیز کو کھانے جا رہا ہے مگر اسے یہ خیال آ جائے کہ میں اسے کھانے تو جا رہا ہوں کہیں میرے سرکار نے اسے حرام تو نہیں کہا......؟ بس وہ نوالہ اب حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا، اسے اگل دے گا، پھینک دے گا، ایسے ہی اگر وہ کسی طرف بڑھتا جا رہا ہے اور اسے خیال آئے کہ کہیں آقائے دوجہاں نے وہاں جانے سے روکا تو نہیں......؟ اب یہ قانون اس کے پاؤں کی بیڑی بن جائے گا، قانون کا احترام اور اس کی عظمت اسے آہنی زنجیروں میں جکڑ دیں گے، اب وہ ایک قدم بھی آگے نہیں کھسک سکتا۔

بس معلوم ہوا ہمیں وہ لینا ہے جو ہمارے سرکار ہمیں دیں اور ان چیزوں سے آنکھیں پھیر لینی ہیں، دامن سمیٹ لینا ہے، کترا کر گزر جانا ہے جن چیزوں سے سرکار نے ہمیں روک دیا ہے۔

میں نے ابھی ایک بات آپ سے عرض کی تھی کہ اردو ادیب تو صرف بولتا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا لیکن اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میرے خواجہ نے عملاً اسے کر کے بھی دکھا دیا۔ آپ کو یاد ہوگا جب سلطان ہند غریب نواز علیہ الرحمہ اجمیر شریف تشریف لائے تو انہیں اہلاً وسہلاً نہیں کہا گیا، ان کا پرتپاک خیر مقدم نہیں ہوا بلکہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں اور نوع بنوع امتحانات لیے گئے لیکن میرے غریب نواز کو ہر میدان میں فتح و نصرت اور بالادستی حاصل رہی۔

عہد جاہلیت کے فراعنہ انہیں اپنی نت نئی ترکیبوں سے زیر کرنا چاہتے تھے مگر اللہ کا یہ برگزیدہ بندہ اپنی حکمت عملی اور قوت باطنی سے اس کی ایسی کاٹ کرتا کہ ان کا ہر طلسم تار عنکبوت سے کمتر ثابت ہوتا۔

اس عہد کے راجپوت اسے برداشت نہیں کر پا رہے تھے کہ ہم صنم پرستوں کے بیچ یہ نماز، روزے اور مصلی اور تسبیح والا کیسے آ گیا۔ ایک مقدس دروازہ کے قدسی صفات مہمان کے

ساتھ ظالموں سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ سب کر دکھایا لیکن غریب نواز کے پائے استقامت میں جنبش نہ آئی، وہ ایسے ہی جمے رہے جیسے کوہ ہمالیہ اور تارا گڑھ کا پہاڑ زمین کی چھاتی پر جما ہوا ہے۔ آلام و مصائب کے پہاڑ توڑے گئے، ہر چند کوشش کی گئی کہ یہ پردیسی یہاں سے بھاگ کھڑا ہو لیکن غریب نواز بہت خاموشی سے عملاً انہیں یہ بتاتے رہے کہ اگر بھاگنا ہی مقصود ہوتا تو یہاں میں آتا ہی کیوں؟ اسے مستقبل ہی بتائے گا کہ ہمارا بوریا بستر گول ہوتا ہے یا تمہارا۔

دریا کوزے میں :۔

چنانچہ وقت کے راجہ نے اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکا اور غریب نواز اور ان کے معتقدین پر "اناساگر" کا پانی بند کر دیا۔ متوسلین نے عرض کیا اب تو جور و جفا اور ظلم و ستم کی حد ہو گئی، ظالموں نے اناساگر کے پانی پر پہرہ بٹھا دیا ہے، ہم اب اس کی ایک بوند تک نہیں پا سکتے۔ گویا میدان کربلا اپنی تاریخ کو دہرانا چاہتا ہے۔ اللہ کے ولی سلطان ہند نے فرمایا یہ چھاگل لو اور اناساگر کا پانی اس میں بھر لاؤ۔

اگر آج کا مرید ہوتا تو جاتا نہیں بلکہ پیر سے مناظرہ کرتا کہ حضور! کہاں اناساگر، جو کہنے میں ساگر اور دیکھنے میں جھیل معلوم ہوتا ہے بھلا اس کا پانی اس میں کیسے آ سکتا ہے لیکن وہ پندرہویں صدی کا مرید نہیں تھا بلکہ نگاہ خواجہ کا پروردہ تھا، اس نے درسگاہ خواجہ میں تربیت پائی تھی جن کی ایک نگاہ کرم چور کو سلطان، محکوم کو حاکم، اور وہی نگاہ عتاب راجہ کو پرجا بنا دے۔ جو آن کی آن میں انسانیت کی کایا پلٹ دے۔ حکم پاتے ہی مرید نے چھاگل اٹھائی، چونکہ وہ جانتا تھا کہ بھیجنے والا چھاگل بھی دیکھ رہا ہے اور ساگر بھی۔

لہذا وہ اناساگر کے قریب پہنچا اور اناساگر کی بوند بوند، قطرہ قطرہ چھاگل میں بھر لایا۔

اب ساگر ساگر نہ رہا بلکہ چٹیل میدان بن گیا۔

اب اجمیر والوں کی آنکھ کھلی، دن میں تارے نظر آنے لگے، پاؤں تلے زمین کھسک گئی، تب غریب نواز نے اپنی خاموش اداؤں سے سمجھایا کہ ہمارا اور تمہارا یہی تو فرق ہے کہ تم پانی کو تلاش کرتے ہو اور پانی ہمیں تلاش کرتا ہے۔ آنکھیں کھولو، ہوش میں آؤ، دیکھو کہ تم کس سے

آنکھیں ملانا چاہتے ہو۔

میں نے یہی تو عرض کیا تھا کہ اردو کا ادیب صرف بولتا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیا مگر میرے غریب نواز نے اسے عملاً کر کے دکھا دیا۔

معاً ایک بات سطحِ ذہن پر ابھر آئی کہ کوئی نیا تخیل، نیا نکتہ، اور نئی دریافت ہو، لہٰذا مجھے اجازت دیجئے کہ وہ بات عرض کی جائے۔

انا ساگر کو کوزے میں بھر تو لیا گیا مگر یہ صرف چلتا پھرتا واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ معاندین کے ایک اہم سوال کا مسکت اور دندان شکن جواب ہے۔ بہت ہی ہوش سے سن لیجئے کہ سوال کربلا پر تھا اور جواب اجمیر میں مل رہا ہے۔

اب میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں، ذہن و فکر کی بھرپور توانائیوں سے آنے والی گفتگو کو سماعت فرمائیں۔

حسین مظلوم تھے، مجبور نہیں :۔

ہمارا یہ کہنا کہ سید الشہداء، نواسہ رسول، جگر گوشہ بتول، سیدی سرکار امام عالی مقام میدان کربلا میں "مظلوم" تھے مگر "مجبور" نہیں تھے، اگر پانی کے ارادے سے کربلا کی زمین پر اپنی ایڑیوں سے ٹھوکر مار دیتے تو ندیاں بہہ جاتیں، چشمے ابل پڑتے، میدان نینوا جل تھل ہو جاتا، **ہر طرف پانی ہی پانی** نظر آتا، وہ محض ولی نہیں ولی گر تھے، آج بھی جس مردِ مسلمان پر اپنی نگاہ کرم و نظر **عنایت اٹھا دیتے تو ولی بنا دیتے**، اسی لیے تو حضرت نیاز بریلوی نے فرمایا ہے:۔

اے دل بگیر دامن سلطان اولیاء
یعنی حسین ابن علی جان اولیاء

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ درس گاہ نبوت میں حسین کو پڑھایا ہی نہیں گیا بلکہ پلایا بھی گیا ہے۔

واضح رہنا چاہیے کہ میرے سرکار پڑھاتے بھی تھے اور پلاتے بھی تھے۔ اس عنوان پر میری ایک مستقل تقریر ہے۔ "درسگاہ اور خانقاہ" درسگاہ میں پڑھایا جاتا ہے اور خانقاہ میں پلایا جاتا ہے یعنی ایک عالم ظاہر کسی طالب علم کو جو علم پندرہ برس میں دیتا ہے اللہ کا ولی اگر وہی علم کسی کو دینا چاہتا ہے تو

آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے اور کلیجے میں انڈیل دیتا ہے کیونکہ درس گاہ میں پڑھایا جاتا ہے اور خانقاہ میں پلایا جاتا ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ حسین کو صرف پڑھایا نہیں گیا بلکہ علم ظاہر و علم باطن پلایا بھی گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام کا یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار آقائے دو جہاں نے چند صحابہ کرام کو تبلیغ اسلام کے لیے فرمایا کہ تم فلاں جگہ جاؤ تم فلاں جگہ جاؤ وغیرہ وغیرہ۔ صحابہ کرام نے انتہائی ادب و احترام سے عرض کیا یا رسول اللہ! حکم سر آنکھوں پر، لیکن سرکار ہمیں جہاں بھیج رہے ہیں ہم وہاں کی زبان نہیں جانتے، اس جانے کا حاصل کیا ہوگا۔

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

مگر یہ حضرات رات کو سوئے اور صبح جب اٹھے تو جسے جہاں جانا تھا اسے وہاں کی زبان معلوم ہو چکی تھی۔ اس زبان پر وہ قابو پا چکے تھے۔

یہی میرا مدعا ہے کہ سرکار پڑھاتے بھی تھے اور پلاتے بھی تھے۔ اس کو پڑھانا نہیں کہا جاتا اس کو پلانا کہتے ہیں۔

اب آیئے اصل مقصد، میں یہی تو کہہ رہا تھا کہ سرکار امام حسین ولی بھی تھے اور ولی گر بھی تھے۔ انہیں صرف پڑھایا ہی نہیں گیا بلکہ پلایا بھی گیا۔ صرف درسگاہ نبوت ہی میں نہیں درس گاہ مرتضیٰ اور تربیت گاہ فاطمہ میں بھی ان کی تعلیم ہوئی ہے۔ متن درسگاہِ مصطفیٰ ہے اور مرتضیٰ و بتول زہرا اس کے شروح و حواشی ہیں۔ ایسے متن کے لیے ایسے ہی حاشیہ نگاروں کی ضرورت تھی، پھر کیا کہنا اس متعلم کا جس کے معلم مصطفیٰ ہوں اور حاشیہ نگار مرتضیٰ و فاطمہ ہوں۔

اسے علم سفینہ نہیں بلکہ علم سینہ کہا جاتا ہے گویا حسین کو پڑھایا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ پلایا بھی جا رہا ہے۔ پھر کیا کہنا ان پلانے والوں کا جس نے خود اپنے آپ کو علم کا شہر کہا اور علی کو اس کا دروازہ۔ خیال تو فرمایئے بات کہاں سے کہاں تک پہنچی۔

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا ترجمہ:۔ میں علم کا شہر ہو علی اس کا دروازہ ہے۔

اب خیال فرمایئے بات کہاں سے کہاں پہنچی جو خود براہ راست مصطفیٰ، مرتضیٰ اور سیدہ

فاطمہ سے لے رہا ہو اس کی وسعتِ علم کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے۔ نہ تو دینے والوں میں کوئی کمی اور نہ لینے والے میں، کوئی پڑھا رہا ہے اور کوئی پڑھ رہا ہے، کوئی پلا رہا ہے کوئی سیراب ہو رہا ہے۔

ذرا غور تو فرمایئے، جس کی ایک نگاہ نبوت نے سیدنا ابوبکر کو، صدیق .... سیدنا عمر کو، فاروق .... سیدنا عثمان کو، غنی وغنی اور سیدنا علی کو ولی بنایا ہو، اس نے کیا کچھ حسین کو نہ دیا ہوگا۔ ہم سوچتے سوچتے ختم ہو جائیں مگر اس لینے اور دینے کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں۔

اللہ اکبر! کیا کہنا حسین کے علو مرتبت کا جس نے مصطفیٰ کی گود میں معرفتِ حق حاصل کی ہو اور سیدنا علی کے کاندھوں سے کائنات کی بلندی کو دیکھا اور چھوا ہو اور حضرت سیدہ فاطمہ کی چادر میں سمٹی ہوئی پوری کائنات کا مطالعہ کیا ہو۔

کوئی بدباطن اور آنکھ کا اندھا ہی کہہ سکے گا کہ حسین ولی نہیں تھے یا پھر وہ کربلا میں مجبور تھے۔

آؤ دیکھو کہ حسین کو کیسے پلایا جاتا تھا کبھی کبھی انتہائے محبت و پیار میں سرکار ابد قرار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک کو ہونٹوں سے باہر کر دیتے اور حسین اس کو چوسا کرتے۔

مجھے کہہ لینے دیجئے کہ ایک ظاہر بین آنکھ تو صرف یہ دیکھ رہی ہے کہ نواسہ رسول، نانا جان کی زبان چوس رہا ہے مگر ایک حق نگر، حق شناس آنکھ اس کے سوا یہ بھی دیکھ رہی ہے زبان کون چوس رہا ہے؟ کس کی زبان اور کون سی زبان چوس رہا ہے؟

ذہن وفکر پر دباؤ ڈالیے اور میرے جملے پر غور کیجئے کس کی زبان اور کون سی زبان ہے؟ کبھی بولے تو قرآن بن جائے اور کبھی گویا ہو تو حدیث کا سرمایہ مل جائے۔ گویا اسی ایک زبان سے دونوں چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اسی نوک زبان سے قرآن بھی ہے اور اسی زبان سے حدیث بھی۔ لہٰذا اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ خالی زبان نہیں چوسی جارہی ہے، بلکہ اس کے پردے میں حکمتِ قرآن اور رموز احادیث پلائے جارہے ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذَالِکَ

اب تو یقین ہو گیا ہوگا کہ امام حسین صرف ولی نہیں ولی گر تھے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ کربلا میں حسین مظلوم تھے مجبور نہیں تھے اگر وہ چاہتے تو ایڑیوں کی ٹھوکر سے میدان کربلا کو جل تھل کر دیتے۔

سوال کربلا کا جواب اجمیر سے:۔

اس تفصیل میں کہیں میرا عنوان بھول نہ جایئے گا کہ سوال کربلا پر ہے اور جواب اجمیر سے مل رہا ہے، لہٰذا پھر اسی نقطہ آغاز پر آجایئے کہ امام، کربلا میں مظلوم تھے مجبور نہیں تھے۔

ایک سوال:۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ حسین مجبور نہیں تھے بلکہ مظلوم تھے تو ہمارا معاند امام عالی مقام کا دشمن یہ سوال کرتا ہے کہ اگر حسین مجبور نہیں تھے تو علی اصغر کے لیے پانی کیوں نہ منگوایا؟ چھ مہینے کے بچے کا چہرہ اُترا ہوا ہے، ہونٹوں پر خشکی اور پپڑی ہے، آنکھ کے ڈھیلے ابھر رہے ہیں، گلے میں کانٹے پڑ گئے ہیں اور مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی حسین پانی نہ منگوا سکے۔

جواب:۔ یہی تو وہ مقام ہے جہاں ہم پہنچانے جارہے ہیں، چونکہ امام حقیقت آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں یہاں کرامت کا مظاہرہ کرنے نہیں آیا، اگر کوئی کرامت دکھائی اور اس کی مدد سے کام لیا تو بات ہی کیا رہ گئی، زیادہ سے زیادہ باب کرامت میں دو چار کرامتوں کا مزید اضافہ ہو جائے گا۔

امام حسین کو یقین تھا کہ نانا جان کی امت پر تو یہ پہلی کربلا ہے ابھی نہ جانے کہاں کہاں دانہ پانی بند کیا جائے گا اگر آج میں نے کرامت سے کام لیا اور پھر کہیں یہی حالات پیدا ہوئے تو یہ امت مسلمہ کلیجہ مسوس کر رہ جائے گی اور یہ سوچ کر اس کی ہمت پست ہو جائے گی کہ ہم میں سے کوئی حسین کرامت والا نہیں، لہٰذا یہ معرکہ کیسے سر کیا جائے؟

حسین اس یقین واثق کے ساتھ میدان کربلا میں ڈٹے ہوئے ہیں مادی طاقتوں کے سامنے مادی جنگ کی جائے گی، لہٰذا علی الرغم کھلے بندوں یہ کہہ دیا:۔

ادھر آؤ پیارے ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

حسین کرامت والے ہیں مگر آپ کرامت دکھا نہیں رہے کیونکہ انہیں قوم کو دستور

حیات اور اصول زندگی دینا ہے۔ یعنی اے لوگو! اگر تم جینے کا ڈھنگ سیکھنا چاہتے ہو تو حسین کو فاطمہ کے آنگن میں دیکھ لو اور اگر مرنے کا سلیقہ سیکھنا چاہتے ہو تو حسین کو کربلا میں دیکھ لو، میں تمہیں موت و زندگی دونوں کا سبق پڑھانے آیا ہوں۔

لیکن ہمارا معاند بہت ہی ضدی اور ہٹ دھرم ہے وہ ہماری اس بات پر مطمئن نہیں ہوتا بلکہ گلے کی رگیں پُھلا پُھلا کر کہتا ہے کہ ہم یہ نہیں جانتے ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر امام حسین کرامت والے تھے تو علی اصغر اور خیمہ میں موجود دوسرے اعزاء و اقرباء کے لیے "پانی" کیوں نہ منگوایا۔

اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ میں نے یہی تو کہا تھا کہ سوال کربلا پر ہے اور جواب اجمیر سے دیا جا رہا ہے۔

ارے نادانو! میرے غریب نواز نے "اناساگر" کا پانی منگوا کر کیا بتایا......؟ یہی تو بتایا کہ میں اولادِ حسین ہوں، وہ میرے باپ دادا ہی تو ہیں اور درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ لہٰذا تم کربلا ہی کو مت دیکھو! اجمیر بھی دیکھو کہ جب ان کا بیٹا، پوتا ایسی کرامت والا ہو سکتا ہے تو ان کے اجداد و امجاد کی کرامتوں کا کیا عالم ہوگا لیکن ہمارا حریف نہ ماننے کی قسم کھائے بیٹھا ہے۔ وہ کہتا ہے ہمیں منطق و فلسفہ کی بھول بھلیاں نہیں چاہییں، ہم تو آنکھوں کا مشاہدہ چاہتے ہیں، لہٰذا بات وہ کہو جو کلیجے میں اتر جائے۔

لہٰذا اے دوستو! ہمارے حریف کو آواز دو میں اب وہ بات کہنے جا رہا ہوں کہ ذہنوں کے زنگ آلود تالے ٹوٹ جائیں گے۔ اب میں آپ کے انصاف کا طلب گار ہوں، ہمارے حریف سے کہہ دیجئے کہ وہ پانی منگوانا ہی نہ دیکھے بلکہ یہ بھی دیکھے کہ حسین کے سامنے کون ہے اور خواجہ کے سامنے کون......؟

اب مجھے عرض کر لینے دیجئے کہ حسین کے سامنے یہ ہیں (داڑھی پر ہاتھ پھیر کے) یعنی داڑھی والے اور خواجہ کے سامنے وہ ہیں (سر پر ہاتھ پھیر کے) یعنی اریل والے لہٰذا معلوم ہونا چاہیے کہ کرامت اریل والوں کو دکھائی جاتی ہے داڑھی والوں کو نہیں۔

سیدنا حسین پر تو یہی جلال طاری تھا کہ نانا کا کلمہ بھی پڑھتا ہے اور کرامت بھی دیکھنا چاہتا ہے، اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ سوال کربلا پر تھا اور جواب اجمیر سے مل رہا ہے۔

معذرت کے ساتھ بات بہت پھیل گئی، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول اللہ جو دیں اسے لے لو اور سرکار جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔ اب ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ رسول خدا نے ہمیں کیا دیا اور ہم نے کیا لیا، وہ کیا دیں اور ہم کیا لیں۔ کیا وہ درہم و دینار دیں تو ہم لے لیں، وہ زر، زمین دیں تو ہم لے لیں، باغ باغیچہ دیں تو ہم لے لیں وغیرہ وغیرہ۔

اس لیے اس لین دین سے پہلے یہ سوچنا پڑے گا کہ منصب نبوت کیا ہے؟ منصب رسالت کیا ہے؟ رسول اپنی امت کو کیا دے اور کیا دینے آیا ہے؟ پھر وہی سوال باقی رہ گیا کہ ہم کیا لیں۔

اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ نبی جس چیز کو فرض کہیں تم اسے فرض کہو، جسے واجب کہیں اسے واجب کہو، جسے حلال کہیں اسے حلال کہو، جسے حرام کہیں اسے حرام کہو، جسے جائز کہیں اسے جائز کہو، جسے ناجائز کہیں اسے ناجائز کہو، جسے مکروہ کہیں اسے مکروہ کہو، جسے تنزیہی کہیں اسے تنزیہی کہو، جسے تحریمی کہیں اسے تحریمی کہو، جسے مباح کہیں اسے مباح کہو، جسے مستحب و مستحسن کہیں اسے مستحب و مستحسن کہو، جسے شرک کہیں اسے شرک کہو، جسے بدعت کہیں اسے بدعت کہو۔

اس طرح کے احکام اوامر و نواہی، اصول و ضوابط خواہ وہ معاش سے متعلق ہوں یا معاد سے، کسی سے بھی متعلق ہوں ہم اس میں رسول اللہ کے حکم کے پابند ہیں۔ گویا شریعت محمدی ﷺ کے ٹکسال میں یہ وہ کھنکھناتے سکے ہیں جسے تم اپنی من مانی استعمال نہیں کر سکتے۔ شرک وہیں بولو جہاں مصطفیٰ بلوانا چاہیں اور بدعت ضلالت اسے کہو جسے مصطفیٰ کہلوانا چاہیں، اب آپ اس اجمال کی تفصیل میں آجائیے۔

مزارات کی حاضری، اعتراض و جواب:۔

یعنی اگر کوئی خواجہ غریب نواز کی قبر اطہر پر نہیں جانا چاہتا تو اپنے نہ جانے کی دلیل میں وہ یہ کہہ سکتا

ہے کہ میرے آقاؤں نے مجھے روکا ہے، میری کتابوں نے مجھ پر پابندی لگائی، میرے مولویوں نے مجھے منع کیا، میرا نفس اور میرا ضمیرا انکار کرتا ہے۔ نہ جانے کی دلیل میں وہ یہ ساری باتیں کہہ سکتا ہے مگر شرک و بدعت نہیں بول سکتا یعنی شرک وہیں بولو جہاں رسول خدا بلوانا چاہیں اور بدعت وہیں کہو جہاں مصطفٰی کہلوانا چاہیں۔ یہ تمہاری تجوری کا خانہ ساز سکہ نہیں ہے کہ اسے جہاں چاہو استعمال کرلو۔

آج کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اولیائے کرام کے مزاروں پر نہ تو خود جاتے ہیں اور نہ ہی کسی کو جانے دینا چاہتے ہیں۔ جہاں دیکھئے وہ شرک و بدعت کا پٹارہ لیے بیٹھے ہیں۔ شرک و بدعت کی تفصیلی بحث تو آپ اسی عنوان کے تحت سماعت فرمایئے گا آج میں ان گرہوں کو کھول دینا چاہتا ہوں جو مزارات کی حاضری سے متعلق ہیں۔

سب سے پہلے تو آپ یہ ذہن نشین کرلیں کہ مزارات پر جاتے تو ہم لوگ ہیں مگر حاشیہ یہ لگاتے ہیں۔ گویا کتاب ہماری ہے اور ترجمہ آنجناب کررہے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ تم ہوٹلوں میں ہمارے خلاف بولتے ہو، قہوہ خانوں میں ہماری غیبت کرتے ہو، چوراہے پر ہمارے خلاف زہرافشانی کرتے ہو، کوچہ و بازار میں ہمارے اوپر طعنے کستے ہو، اٹھتے بیٹھتے ہمیں قبر پجوا کہتے ہو، اس کے باوجود تمہارا کہنا ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں کہتے، آخر اس الزام تراشی، بہتان بندی، غلط بیانی اور بدزبانی کے بعد تم اور کیا کرنا چاہتے ہو؟ کیا چوراہے کی جنگ لڑنا چاہتے ہو یا ہاتھا پائی کرنا چاہتے ہو؟ اور جہاں تمہارا بس چلتا ہے وہاں یہ بھی ہو رہا ہے، تمہیں شرم و غیرت آنی چاہیے۔ خالص عقیدے اور علمی مسائل کو تم نے اپنی چرب زبانی اور قوت بازو کی آزمائش گاہ میں ڈال دیا ہے۔

علاوہ ازیں یہ فرائض و واجبات کی حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض فروعی مسائل ہیں اور تم نے انہیں اس قدر اچھال دیا ہے کہ قوم دو دھڑوں میں بٹ گئی اور ہماری اکائی دوئی سے بدل گئی، آج ان ہی مسائل کا ہر جگہ رونا رویا جا رہا ہے۔

اے چشم اشک بازو ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو جل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

اے نادانو! انصاف و دیانت کا گلا مت گھونٹو، ان تمام خرافات اور الزام تراشیوں کے بعد تم یہ کہہ کر گزر جانا چاہتے ہو کہ ہم تو کچھ نہیں کہتے۔

بڑے پاک دامن بڑے نیک طینت
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

ہمارا مطالبہ:۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم تمہاری نظر میں "قبر پجوا" ہیں تو اسے گلی کوچے میں کہنے کے بجائے خود ہم سے کیوں نہیں کہتے۔ ایک بہت ہی سادہ سا شعر سطح ذہن پر ابھر آیا سماعت فرمائیں۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

یہ کیا بات ہوئی کہ ہماری بات غیروں سے کہو اور ہم سے نہ کہو، لہذا جب بات آ ہی گئی ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان کی شکایات و اعتراضات پر ایک فیصلہ کن گفتگو کرلی جائے تاکہ ذہن میں کوئی چبھتا ہوا کانٹا نہ رہ جائے، اب ہم تدریجاً اپنے معمولات کا سرسری جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

ایک نئی بحث کا آغاز (قبر کی حاضری اور دیگر مراسم):۔

قبر کی حاضری، ایصال ثواب، چادر اور پھول ڈالنا، مدد مانگنا، چادر چومنا وغیرہ وغیرہ جہاں تک قبروں کی حاضری کا مسئلہ ہے، "یادیں مٹائی نہ جائیں بلکہ انہیں برقرار رکھا جائے" (۱) یہ اسی گفتگو کی تفصیل ہے جو اس عنوان کے تحت آ چکی ہے۔

آپ اسے ملاحظہ فرمائیں اس میں اچھے خاصے اشارات ملیں گے جس میں، میں نے یہ واضح کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر پر دیکھا۔ ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شہدائے احد کی قبروں پر دیکھا، ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیکھا کہ انہوں نے رسول اللہ کی قبر انور، صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی قبور انور پر حاضری دی۔ سید احمد کبیر رفاعی نے حاضری دی۔ خود سرکار خواجہ غریب نواز نے داتا گنج بخش لاہوری کی قبر پر حاضری دی۔ خود سرکار نے فرمایا کہ جس نے حج کیا اور میری قبر پر

(۱) مصنف کی کتاب "یادیں مٹائی نہ جائیں بلکہ انہیں برقرار رکھا جائے" ادارہ کے تحت پہلے ہی شائع ہو چکی ہے۔

حاضری نہ دی اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ سرکار نے یہ بھی فرمایا جس نے میری قبر اطہر پر حاضری دی اس پر میری شفاعت واجب ہوگئی۔

لہٰذا اس مقام پر سمجھنے کے لیے یہ اشارات کافی ہیں، اب اس پر ہمیں ساری گفتگو کرنا نہیں ہے۔

مغالطہ (چومنا اور پوجنا):۔

ان کا سب سے بڑا فریب اور مغالطہ یہ ہے کہ یہ "چومنے" کو "پوجنا" کہتے ہیں۔

خود میرا معمول یہ ہے کہ میں غریب نواز کے آستانہ پر حاضری دیتا ہوں تو میں حاضری میں بلند دروازہ جو نظام حیدر آباد دکن کی غلامی کی نشانی ہے، میں اس کا پہلا زینہ چومتا ہوں اور یہ چومنا رات کے اندھیرے اور کالی کوٹھڑی میں نہیں بلکہ لاکھوں لاکھ کے مجمع میں تھا۔ گویا میں نے چوما اور انہوں نے کہا کہ پوجا۔

اب ان سے دریافت کیجئے اگر اس طرح کے چومنے کا نام پوجنا رکھ دیا جائے تو اس دنیا میں ہمیں کوئی مسلمان مل سکے گا؟

واحسرتا! مسلمانوں کو کافر و مشرک بنانے کا جذبہ اپنی حدود سے اس قدر تجاوز کر چکا ہے کہ اس نے آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دی کہ حق و ناحق کا امتیاز جاتا رہا۔ اس لیے مجھے کہہ لینے دیجئے کہ پوجنا اور ہے اور چومنا اور ہے۔ پوجنا وہاں بولا جاتا ہے جہاں کسی کو معبود سمجھ کر حاضری دی جائے۔ خوش عقیدہ سنی مسلمان ہر چند کہ اولیائے اللہ کے مزارات پر حاضری دیتا ہے مگر وہ صاحب مزار کو اللہ نہیں کہتا بلکہ محبوب خدا کہتا ہے، وہ بزرگان دین کے کشف و کرامات اور ریاضت و مجاہدات کا قائل ہے مگر وہ ان کو اللہ کی مخلوق اور بندہ ہی کہتا ہے۔ وہ انہیں ہرگز ہرگز اللہ اور خدا نہیں کہتا۔ عقیدے کی اس صراحت کے باوجود چومنے کو پوجنا کہنے کو تعصب، تنگ نظری، دلی دشمنی، الزام تراشی اور حقائق سے چشم پوشی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

ع آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے؟

یہ تو ایسا کوئی سرپھرا ہی ہوگا جو کہے کہ بندہ نہیں خدا لیتا ہوا ہے۔ یہ عقیدہ تو مسلمانوں کو ماں کی گود میں ہی مل جاتا ہے کہ اللہ حی قیوم ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ اللہ کو موت نہیں،

جب موت نہیں تو اس کی قبر نہیں، جب قبر نہیں تو اس کی چادر نہیں، معلوم ہوا قبر اور چادر یہ خدا کے لیے نہیں ہیں بلکہ یہ تو محبوب خدا کے لیے ہے۔

اتنی واضح صراحت کے بعد بھی پوجنے اور چومنے کا فرق نہ سمجھا جائے تو اس کے علاوہ اور کیا کہیے۔

یا رب نہ وہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

میں نے دہلیز کو چوما، چوکھٹ کو چوما، چادر کو چوما، اس چومنے کو انہوں نے پوجنے سے تعبیر کیا۔ میں انصاف کا طلب گار ہوں اگر اس چومنے کا نام پوجنا رکھ دیا جائے تو حجر اسود بھی چوما جاتا ہے، غلاف کعبہ بھی چوما جاتا ہے، قرآن کا جزدان بھی چوما جاتا ہے، اب کیا یہ چومنے والے سب کے سب پجاری ہیں اور مشرک ہیں؟ بتلائیں؟

ایک بات یہیں واضح کردی جائے، تاکہ پوجنے اور چومنے کا فرق نمایاں ہو جائے۔

اسلام کا دور آغاز دیکھئے کہ رسول خدا نے اللہ کے گھر سے تین سو ساٹھ پتھروں کو نکال پھینکا۔ یہ سب پتھر ہی تو تھے لیکن اسی گھر میں ایک پتھر کو نصب کر دیا جسے چوما جاتا ہے۔ اب اس فرق کو واضح کیجئے کہ دونوں پتھر ہی تو ہیں مگر ایک کو نکالا گیا اور دوسرے کو جمایا گیا، نصب کر دیا گیا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو پتھر پوجا جاتا تھا اسے نکال دیا گیا اور جو چوما جاتا تھا اسے جما دیا گیا۔ جب اللہ کے گھر میں پتھر چوما جائے اور اسے پوجنا نہ کہا جائے تو غریب نواز کی چوکھٹ اور دہلیز پر چومنے کو پوجنا کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟

چادر چومنا:۔

خوش عقیدہ مسلمان نماز فجر کی ادائیگی کے بعد قرآن کی تلاوت کرنا چاہتا ہے تو پہلے تلاوت نہیں کرتا بلکہ اسے چومتا ہے۔ جب وہ چومتا ہے تو ہونٹ کس پر پڑتا ہے۔ آخر جزدان ہی پر تو؟ یہ کپڑا ہی تو ہے؟ تو کیا مسلمانوں کو کپڑا چومنے کا ہیضہ ہو گیا ہے؟

اگر ایسی بات ہوتی کہ ہمارا مزاج کپڑا ہی چومنے کا ہوتا تو ہم کسی کلاتھ مرچنٹ کے ہاں جاتے اور خوب کپڑے چومتے، اپنی شیروانی چومی جاتی، اپنا دامن چوما جاتا مگر ایسا نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ وہ جزدان کو کپڑا سمجھ کر نہیں چوم رہا ہے بلکہ نسبت قرآن کو چوم رہا ہے۔

بس ایسے ہی جو مسلمان اللہ کے ولی کی قبر کی چادر چوم رہا ہے اس لیے نہیں کہ کم خواب ومخمل سمجھ کر چوم رہا ہے بلکہ نسبت ولایت اور نسبت خواص کو چوم رہا ہے کسی کمتر اور چھوٹی شئے کو جب کسی بڑی شئے سے نسبت ہو جاتی ہے تو اس میں بھی بڑائی آجاتی ہے۔

نسبت کی بحث (تعظیم، نسبت، بوسہ):۔

نسبت بذات خود نہ تو حسن ہے اور نہ قبح۔ نسبت کی اچھائی، بُرائی منسوب الیہ کے اعتبار سے ہے جیسے زمان، مکان نہ فی نفسہ حسن ہے اور نہ قبیح۔ مثلاً جمعہ کا دن افضل ہے چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی ولادت باسعادت کا دن ہے اور دوشنبہ سب سے افضل ہے چونکہ سرکار کی ولادت باسعادت کا دن ہے۔

(۱) ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضور ہم دوشنبہ کو روزہ رکھیں۔ حضور نے فرمایا: ہاں چونکہ ولدت فیه میں اسی دن پیدا ہوا ہوں۔ ایسے ہی زمین کا وہ حصہ جس سے سرکار کا جسد اطہر لگا ہے وہ کائنات کے ہر حصہ سے افضل واعلیٰ ہے۔

(۲) سیدنا امام مالک جو اکابر محدثین سے ہیں اور جن کو حضور ﷺ نے بطور پیشن گوئی عالم مدینہ فرمایا ہے وہ ایک مرتبہ علماء وفضلاء کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ ایک کچی اور پرانی دیوار کو دیکھ کر آپ نے بوسہ دیا۔ لوگوں کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ اس دیوار کی قدامت اور پرانا پن یہ بتلاتا ہے کہ ممکن ہے ادھر سے میرے سرکار کا گزر رہا ہو اور سرکار نے اپنا دست کرم اس پر رکھ دیا ہو۔ اس لیے اس کو نسبت ہے میرے سرکار سے۔

(۳) حضرت علامہ جامی علیہ الرحمہ کا مدینہ کی سرزمین پر پیشاب وپاخانہ نہ کرنا اور جواب میں یہ فرمانا کہ کہیں اس مقام پر میری سرکار کا قدم ناز، زندگی مبارک میں نہ پڑ گیا ہو۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں سرکار کا قدم ناز پڑ جائے وہاں پیشاب پاخانہ کیا جائے۔

حضرت جامی نے سرکار کا قدم نہیں دیکھا تھا پھر بھی تعظیم کی یعنی صرف قدم کا تصور تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی تعظیم کے لیے دیکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ تصور بھی انسان کو واجب التعظیم بنا دیتا

ہے مثلاً کعبہ کی تعظیم ہر شخص پر واجب ہے خواہ دیکھے یا نہ دیکھے اس لیے کہ سرکار نے فرمایا کہ کوئی بول وبراز (پیشاب وپاخانہ) کے وقت نہ استقبال قبلہ کرے اور نہ تو استدبار قبلہ۔ یہ حکم دیکھنے یا نہ دیکھنے سے متعلق نہیں ہے۔ جو لوگ تعظیم کا دارومدار دیکھنے پر کرتے ہیں ان کی بناء پر تو صرف وہی تعظیم کرے جو دیکھے یعنی صرف مکہ مکرمہ کے رہائشی وہ لوگ جو کعبہ کی چہار دیواری کو دیکھتے رہتے ہیں وہی اس کی تعظیم کریں لہذا قیام، میلاد میں یہ کہنا کہ کیا تم رسول کو دیکھتے ہو؟ یہ بے عقلی کی دلیل اور خلاف اصول بات ہے۔

(۴) حضرت سیدنا ابو یوسف علیہ الرحمہ قاضی القضاۃ نے ایک شخص کو قتل کا حکم دے دیا۔ صرف اس لیے کہ آپ دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اور کدو شریف تناول فرمارہے تھے جو سرکار کی محبوب ترین غذا ہے۔ آنے والے نے کہا:۔

لاَ اُحِبُّ القَرْعَ — میں کدو کو پسند نہیں کرتا۔

کدو کے محبوب وپسندیدہ نہ ہونے پر قتل کا حکم کیوں دیا [illegible] صرف اس لیے کہ کدو حضور کو پسند ہے۔ کدو کو سرکار سے نسبت ہے۔ "قرع" عربی زبان میں سفید کدو کو کہتے ہیں جس کو ہماری زبان میں لوکی اور کدو دونوں کہتے ہیں۔

(۵) ہدایہ جلد ثالث باب الکراہیۃ کے حاشیہ میں عبد اللہ ابن [illegible] رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ عرب کے بدو یعنی صحرا نشین جنگل کے رہنے وا[illegible] اس وقت مدینہ [illegible] کی طرف سفر کرتے جہاں سے سرحد مدینہ شروع ہو جاتی وہا[illegible] کنکریوں کو لے کر چومتے اور بوسہ دیتے۔

بدویوں سے لوگوں نے دریافت کیا: یہ تم [illegible] رہے ہو؟ کنکر اور پتھر چوم رہے ہو۔ فوراً ان جنگل کے رہنے والوں نے جواب دیا، یہ کنکر، کنکر سمجھ کر نہیں چوما جا رہا ہے بلکہ یہاں سے مدینہ کی سرحد شروع ہو گئی ہے۔ یہاں کے ایک ایک ذرہ کو نسبت ہے میرے سرکار سے، اس لیے یہاں کا ایک ایک ذرہ اس قابل ہے کہ اسے بوسہ دیا جائے، چوما جائے۔

(٦) سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس وقت بیت اللہ شریف کا طواف کرنے آئے تو حجرِ اسود کے مقابل کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا: کہ میں جانتا ہوں تو پتھر ہے اور پتھر چوما نہیں جاتا مگر ذرا ہی دیر کے بعد حجرِ اسود سے لپٹ گئے، بوسہ دیا۔ فرمایا! کیا کروں تجھے نسبت ہے میرے سرکار سے۔

(٧) سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ وعظ فرما رہے تھے، دوران وعظ آپ متعدد بار کھڑے ہوئے۔ وعظ کے بعد لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کے بار بار کھڑے ہونے کی کیا وجہ تھی؟ تو آپ نے فرمایا، خاندان اہل بیت کا ایک چھوٹا سا بچہ کھیل رہا تھا، جب وہ ادھر سے گزرتا تو میں اس کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا یہ کیوں صرف اس لیے کہ اسے نسبت ہے سرکار ﷺ سے۔

٨) جزدان میں لپٹا ہوا قرآن کریم جب ہاتھوں میں لیا جاتا ہے فوراً ہماری نگاہِ عقیدت بوسہ دیتی ہے۔ کیوں؟ کیا اس لیے کہ وہ ٹیری کاٹ جرمن کے کارخانہ سے بن کر آیا ہے؟ یا اس لیے کہ یہ چھینٹ احمد آباد کے کارخانہ کی بنی ہوئی ہے یا اس لیے کہ یہ سوت بنارس میں تیار ہوا ہے۔ نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ جو کپڑا اس قرآن سے لپٹ گیا ہے وہ لایا ہوا ہے محمد رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا۔ قرآن نے نسبت پیدا کر لی ہے مصطفیٰ کریم ﷺ سے۔

٩) جزدان ہٹا کر دفتی چومتے ہیں صرف اس لیے کہ لپٹ گئی ہے قرآنِ مصطفیٰ سے۔

١٠) ایسے ہی ایک انسان خواجہ غریب نواز و شہنشاہِ بغداد کے دربار اقدس میں حاضر ہوتا ہے تو مزار مبارک کی چادر کو چومتا ہے، بوسہ دیتا ہے، حسین و خوبصورت و قیمتی کپڑا سمجھ کر نہیں صرف اس لیے کہ اس کو شہنشاہِ بغداد و سلطان الہند سے تعلق ہو گیا ہے۔ یہ ثمرہ ہے نسبت کا۔

نکتہ:۔

یہ تو دو نگاہوں کا فرق ہے کہ کسی کی نگاہ صرف خواجہ کے روضہ پاک کی اینٹ اور پتھر دیکھتی ہے اور کسی کی حقیقت شناس نگاہ کنکر و پتھر کو چوم کر خواجہ کی روحانیت کو دیکھتی ہے۔ یہ تو نگاہ کا فرق ہے۔

١١) ادائیگی مستحب کے لیے محبت کی ضرورت ہے، محبت خود ایک مستقل قانون ہے اس کو دوسرے قانون کی حاجت نہیں ہے۔ فرائض و واجبات اور سنن کے لیے مار پیٹ دھمکی کی ضرورت پڑتی ہے مگر مستحب کے لیے صرف محبت کی ضرورت ہے۔

یہ قصہ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا وہ آغاز باب تھا

Ishaate Islam

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَ صَلٰوتُ اللّٰہِ وَ سَلاَمُہٗ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ رَّسُوۡلِ اللّٰہِ

وَ اٰلِہٖ وَ صَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پایا جاتا ہے جو سارے مسلمانوں کو اس جرم میں کافر قرار دیتا ہے کہ وہ قبروں کی زیارت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور بزرگوں کا وسیلہ لاتے ہیں۔ اس طرح گویا جمہور مسلمین بت پرستی کا شکار ہیں (معاذ اللہ)۔

اس لیے میں نے مناسب خیال کیا کہ وسیلہ کے بارے میں آئمہ اسلام کی آراء پیش کروں کیونکہ انہیں حضرات کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ توحید، شرک اور بت پرستی کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ سکیں اور ہر ایک کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے دکھا دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ اس مسئلہ سے متعلق کتاب و سنت کے دلائل پیش کر دیئے جائیں اس طرح یہ مختصر رسالہ تیار ہو گیا جسے "محق التقول فی مسئلہ التوسل" کا نام دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق سے ہم گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ وسیلہ کے بارے میں ایک طبقہ کا مزاج یہ ہے کہ اس کو وہ اتنا بڑا جرم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس کے سبب مشرک قرار دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں اس طبقہ نے جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ لچر اور کمزور ہیں۔ اس کے برعکس وسیلہ کے حق ہونے کے جو دلائل ہیں وہ نہایت روشن اور واضح ہیں۔

ان لوگوں کی باتوں میں سچائی کہاں سے ہو سکتی ہے، ان کے خلاف کتاب و سنت کے بھی دلائل ہیں، عقلی دلیلیں بھی اور امت کا متوارث عمل بھی۔

کتاب اللہ:۔

قرآن کہتا ہے:۔

وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ (مائدہ:۳۵) خدا کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔

وسیلہ شخصیتوں کا بھی ہو سکتا ہے اور عمل صالح کا بھی اور لفظ وسیلہ اپنے عموم کے باعث

دونوں کو شامل ہے، بلکہ شریعت میں اس سے شخصیتوں ہی کا وسیلہ پہلے سمجھ میں آتا ہے پھر اس سلسلے میں یہ کہنا کہ صرف زندہ شخصیت کا وسیلہ لیا جا سکتا ہے، یہ اس کا عقیدہ ہو سکتا ہے جس کا خیال ہو کہ روحیں جسموں سے جدا ہونے کے بعد فنا ہو جاتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ حشر و نشر بھی کوئی چیز نہیں اور روحوں کے جسموں سے جدا ہو جانے کے بعد ان کے احساسات و ادراکات بھی فنا ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بات شرعی دلیلوں کے سراسر خلاف ہے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ آیت مذکورہ میں لفظ وسیلہ شخصیتوں سے وسیلہ لینے کو بھی شامل ہے، یہ محض کسی عامی کی رائے نہیں اور نہ ہی ایسا ہے کہ صرف وسیلہ کے لغوی عموم سے اسے اخذ کر لیا گیا ہو بلکہ یہ معنی حضرت فاروق اعظم سے بھی منقول ہے۔ بارش کے لیے دعا میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وسیلہ لیا اور یہ الفاظ استعمال کیے:۔

ھٰذَا وَاللّٰہِ الۡوَسِیۡلَۃُ اِلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ

بخدا! یہ (عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اللہ کے حضور وسیلہ ہیں

سنت:۔

۱) حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:۔

یَا مُحَمَّدُ اِنِّیۡ تَوَجَّھۡتُ بِکَ اِلٰی رَبِّیۡ

اے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! میں آپ کے وسیلہ سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نابینا صحابی کو بذات خود یہ الفاظ بتائے ...... ظاہر ہے اس میں شخصیت کا وسیلہ ہے عمل کا نہیں۔ اس حدیث کو اس کے ظاہری معنی سے پھیر کر کوئی دوسرا معنی نکالنا ہوائے نفس کی پیروی میں تحریفِ کلمات کا ارتکاب کہلائے گا۔

رہی یہ بات کہ نابینا صحابی کی دعا کی مقبولیت حضور کے دعا کر دینے سے ہوئی (جس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں) یا خود انہی صحابی کے دعا کرنے سے ہوئی۔ یہ ہماری بحث سے الگ بات ہے۔ ہماری دلیل تو صرف حضور سے مروی یہ دعا ہے۔ اس روایت پر کوئی تنقید بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ محدثین کی ایک جماعت نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جس کی قدرے تفصیل ہم آگے دے

رہے ہیں۔

۲) حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔

بِحَقِّ نَبِیِّکَ وَ الْاَنْبِیَاءِ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِیْ

اے رب! یہ دعا قبول فرما، اپنے نبی اور مجھ سے پہلے انبیاء کے وسیلہ سے

اس حدیث کے سارے راوی علاوہ روح بن صلاح کے ثقہ اور معتبر ہیں۔ روح بن صلاح کے بارے میں حاکم نے فرمایا ہے "یہ معتبر اور ثقہ ہیں" ابن حبان نے بھی ان کو ثقہ اور معتبر راویوں میں شمار کیا ہے۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وسیلہ میں زندوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اس روایت میں صاف لفظوں میں انبیاء کی جاہ و منزلت سے وسیلہ موجود ہے۔

۳) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ بِحَقِّ السَّائِلِیْنَ عَلَیْکَ

اے اللہ! سوال کرنے والوں کا تیرے یہاں جو حق ہے اس کے وسیلہ سے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

اس میں سارے ہی مسلمانوں کا وسیلہ ہے خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ ہوں۔ اس حدیث کے ایک راوی ابن موفق، ابن مرزوق سے روایت کرتے ہیں اپنی سند کے اندر منفرد نہیں ساتھ ہی ابن مرزوق صحیح مسلم کے راویوں میں سے ایک ہیں اور دوسرے راوی عطیہ کی کئی روایتوں کو ترمذی نے حسن کہا ہے۔ (جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

انبیاء و صلحاء خواہ زندہ ہوں یا وصال کر چکے ہوں، ان کا وسیلہ لانا ہر دور میں امت مسلمہ کا وطیرہ اور طریقہ رہا ہے۔

۴) استقاء (بارش کی دعا) کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہ الفاظ ہیں:۔

وَ اِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا

اے اللہ! ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ لاتے ہیں

یہ الفاظ وضاحت کرتے ہیں کہ صحابہ نے خود صحابہ کا وسیلہ لیا ہے۔ اس روایت میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت کا وسیلہ عیاں ہے۔

یہ جملہ اگرچہ خبر کی صورت میں ہے لیکن انشائے توسل کے لیے لایا گیا ہے اور یہ توسل حضرت عباس سے ہے۔ جملہ خبریہ کے دو ہی مقصد ہوا کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مخاطب کو علم نہیں، مخبر اسے باخبر کرنا چاہتا ہے جیسے کوئی کہے میں کل تمہارے گھر گیا تھا مگر تم موجود نہ تھے...... دوسرے یہ کہ مخاطب تو جانتا ہے مگر مخبر اسے یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں بھی جانتا ہوں، جیسے کوئی کہے کہ کل تم میرے یہاں آئے تھے مگر مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی اور حضرت عمر کے قول (اے خدا! ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ لاتے ہیں) میں خبر کے دونوں ہی معنی ممکن ہیں۔ اس لیے کہ رب تعالیٰ ان کے وسیلہ لانے کو بھی جانتا ہے کہ یہ لوگ اپنے توسل سے واقف ہیں۔ اس لیے حضرت عمر کی اس دعاء سے انشائے توسل اور حضرت عباس کو بارگاہ الٰہی میں وسیلہ لانا ہی مقصود ہے۔

اور حدیث کے ٹکڑے کُنَّا نَتَوَسَّلُ میں بھی وہی کچھ.... ہے جو پہلے جملہ میں ہے۔ اس کے علاوہ صحابی کا قول "کُنَّا نَفْعَلُ کَذَا" "ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس مذکورہ قول کے زمانہ سے پہلے زمانہ میں کسی فعل کے ہونے کو بتاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ صحابہ کرام، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ظاہری زندگی میں بھی اور رفیق اعلیٰ سے جا ملنے کے بعد بھی عام رمادہ تک آپ کا وسیلہ لایا کرتے تھے۔ اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ یہ وسیلہ حضور کی ظاہری زندگی ہی تک محدود تھا، یہ خواہشات نفسانی کی پیروی اور الفاظ حدیث کی تحریف اور تاویل بلا دلیل ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد میں استقاء کے لیے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بجائے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وسیلہ لیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے نزدیک انبیاء سے ان کی وفات کے بعد وسیلہ لینا جائز نہیں، تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ مطلب کسی طرح اس حدیث سے اخذ نہیں ہوتا...... بلکہ یہ ایک ناکام کوشش اور ناممکن خیال ہے۔ اس قائل نے حضرت عمر کی طرف ایسی چیز منسوب کر دی ہے جو ان کے حاشیہ خیال میں بھی

نہیں، ان کی زبان سے ایسے خیال کا اظہار تو بہت دور کی بات ہے۔

ایسا مطلب بتانا اپنی رائے سے ایک صحیح اور صریح حدیث کو لغو اور باطل ٹھہرانے کا مصداق ہوگا۔

ہاں! حضرت عمر کے اس عمل سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ جس طرح نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وسیلہ لایا جا سکتا ہے اسی طرح آپ کے زندہ رشتہ داروں کا بھی وسیلہ لانا جائز اور درست ہے۔ استیعاب از ابن عبدالبر میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ:۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں عام رمادہ ۱۷ھ کے اندر سخت قحط سالی ہوئی۔ حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا، امیر المومنین! بنی اسرائیل جب اس طرح کی قحط سالی میں مبتلا ہوتے تو انبیاء علیہم السلام کے رشتہ داروں کے وسیلہ سے بارش کے لیے دعا کرتے۔ حضرت عمر نے فرمایا...... اچھا تو یہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا، آپ کے والد کے بھائی اور بنو ہاشم کے سردار حضرت عباس موجود ہیں۔ یہ کہہ کر حضرت عمر، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے قحط سالی کا شکوہ کیا۔

کیا اب بھی واضح نہ ہوا کہ حضرت عمر کا حضرت عباس کی شخصیت کا وسیلہ لانا، اس لیے نہ تھا کہ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں، پکار کو سنتے نہیں اور خدا کے یہاں ان کا کوئی مرتبہ نہیں؟ معاذ اللہ! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ ایک بڑا بہتان ہوگا۔

۵) مالک دار سے مروی حدیث ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ قحط پڑا۔ حضرت بلال بن حارث، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوئے اور اس طرح عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کریں۔ لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ حضرت بلال بن حارث کو خواب میں زیارت نصیب ہوئی۔ حضور نے ان سے فرمایا عمر کے پاس جاؤ، ان سے سلام کہو اور بشارت دے دو کہ اب بارش ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کا وسیلہ لانا اس حدیث سے اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ اس سے انکار کی

کوئی گنجائش نہیں۔ یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے۔

(فتح الباری، لابن حجر عسقلانی ص ۹)

۶) حضرت عثمان بن حنیف کی مذکورہ حدیث، جس میں خود نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو دعائے حاجت کی تعلیم فرمائی، حضرت عثمان بن حنیف کو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک کام تھا۔ اس روایت میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کا وسیلہ لایا گیا ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔

اس حدیث کو طبرانی نے صحیح قرار دیا ہے اور ابوالحسن ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اسے نقل کیا ہے، جس کی قدرے تفصیل آگے آرہی ہے۔

محدث کبیر محمد عابد سندی نے وسیلہ سے متعلق روایات و احادیث کو ایک خاص جزء میں جمع کیا ہے۔ یہ مجموعہ بہت جامع اور کافی وشافی ہے۔

امت کا دستور عمل:۔

آغاز اسلام سے اب تک ہر زمانہ میں انبیاء وصلحاء کا وسیلہ لینا امت مسلمہ کا دستور رہا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ میں اتنا کچھ موجود ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

۱) "مناسک امام احمد" میں خدا کی بارگاہ میں، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے وسیلہ لینے سے متعلق ابوبکر مروزی کی روایت موجود ہے۔

۲) شیخ حنابلہ ابوالوفا ابن عقیل نے "تذکرہ" میں مذہب حنابلہ کے مطابق سرکار سے توسل کا طویل الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

۳) ہم نے "السیف العقیل" کے تکملہ میں ان کے الفاظ بیان کر دیئے ہیں۔

۴) امام شافعی کا امام ابوحنیفہ کا وسیلہ لانا صحیح سند کے ساتھ تاریخ خطیب کے شروع میں مذکور ہے۔

۵) حافظ عبدالغنی مقدسی حنبلی نے اپنے لاعلاج پھوڑے سے شفایابی کے لیے امام احمد کی قبر پر ہاتھ پھیرا۔

حافظ ضیاء مقدسی نے اپنے استاذ موصوف سے سن کر اپنی کتاب "الحکایات المنثورہ"

میں یہ واقعہ قلمبند کیا ہے یہ کتاب آج بھی "ظاہریہ" دمشق میں موجود ہے اور لطف یہ کہ خود مؤلف کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ کیا یہ اکابر اسلام قبر پرست تھے......؟

عقل:۔

امام فخری الدین رازی، علامہ سعد الدین تفتازانی، علامہ سید شریف جرجانی اور ان جیسے بڑے بڑے ائمہ اسلام جن سے مشکل مسائل کا حل لیا جاتا ہے، یہ حضرات انبیاء وصلحاء خواہ زندہ ہوں یا دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں، ان سے وسیلہ لینا جائز قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد کون ہوگا جو ان حضرات کو شرک کا داعی اور قبر کا پجاری قرار دے گا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ امت مسلمہ نے ایمان و کفر اور توحید و دین کو انہیں حضرات سے سیکھا ہے۔ یہ بھی سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دراصل ساری مدد مسبب الاسباب ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

اب اس مسئلہ میں ان عظیم شخصیتوں کے اقوال انہیں کے الفاظ میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

(۱) امام رازی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

جو روحیں جسمانیات سے پاک ہو چکی ہیں اور جسموں کی تاریکی سے آزاد ہونے کے بعد عالم بالا سے مل جانے کا شوق رکھتی ہیں، وہ روحیں عالم قدس اور عالم ملائکہ میں پہنچتی ہیں۔ ایسی روحوں کے اثرات اس دنیا کے حالات کے سلسلہ میں رونما ہوتے ہیں۔ یہ مدبرات امر (کاروبار عالم) کی تدبیر کرنے والی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ ایک شخص اپنے استاذ کو خواب میں دیکھتا ہے اور اپنی کوئی مشکل اس کے سامنے رکھتا ہے اور وہ استاذ اس کی مشکل کا حل پیش کر دیتا ہے۔

(۲) نیز امام رازی "المطالب العالیہ"...... یہ کتاب، اصول دین کی اہم اور مفید ترین کتاب ہے، کے مقدمہ ثالثہ، کتاب سابع کی دسویں فصل میں فرماتے ہیں...... انسان کبھی کبھی اپنے (بعد وصال) ماں باپ کو خواب میں دیکھتا ہے اور ان سے بہت ساری چیزوں کے بارے میں سوال کرتا ہے اور وہ لوگ اس کو صحیح جوابات دیتے ہیں اور کبھی تو وہ ایسے دفینہ کی خبر دیتے ہیں جس کا کسی کو بھی

علم نہیں ہوتا۔

(۳) پھر آگے فرماتے ہیں...... اپنے بچپن میں جب میں زیر تعلیم تھا، اس وقت یہ بحث پڑھتا "**حوادث لا اول لها**" "واقعات جن کا آغاز نہیں۔ میں اس بحث کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے والد کو خواب میں دیکھا۔ فرماتے ہیں...... اس بحث کی بہترین دلیل یہ ہے کہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونے کو حرکت کہتے ہیں۔ اس طرح حرکت کا تقاضا ہے کہ اس سے پہلے کوئی چیز موجود ہو اور ازل کا تقاضا ہے کہ اس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو۔ اس طرح دونوں کا ایک ساتھ وجود میں آنا لازماً محال ہوگا۔

پھر مصنف اس دلیل پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اب تک جو کچھ بھی کہا گیا ہے ان میں سب سے بہتر یہ دلیل ہے۔

(۴) میں نے سنا ہے کہ فردوسی نے جب سلطان محمود سبکتگین کے نام پر اپنا مشہور شاہ نامہ مرتب کیا اور سلطان نے اس کا صلہ ادا نہ کیا، تو اس کے اندر ایک طرح کی بددلی پیدا ہوگئی۔ وہ اس کشمکش میں تھا کہ اس نے "رستم" کو خواب میں دیکھا۔ رستم اس سے کہہ رہا ہے تم نے اس کتاب میں میری بڑی تعریف کی ہے اور میں مُردہ ہوں تم کو صلہ نہیں دے سکتا۔ ہاں! میں تمہیں ایک جگہ دفینہ کی نشاندہی کرتا ہوں، تم وہاں جا کر وہ خزانہ لے لینا...... اس کے بعد فردوسی کہا کرتا تھا "مردہ رستم زندہ محمود سے کہیں زیادہ کریم ہے۔"

(۵) امام رازی اسی مقالہ ثالثہ کی پندرہویں فصل میں دلیلیں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں...... اس سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ روح کے جسم سے جدا ہو جانے کے بعد اس میں چیزوں کے معلوم کرنے کی قوت باقی رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا اہم اصول ہے جس سے علم المعاد، حشر و نشر کے بارے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

(۶) امام رازی اسی مقالہ کی اٹھارہویں فصل میں فرماتے ہیں...... یہ اٹھارہویں فصل اموات و قبور کی زیارت سے استفادہ کے بیان میں ہے۔

پھر فرماتے ہیں...... اس مسئلہ کے بارے میں ایک عظیم سلطان بادشاہ محمد بن سام بن

حسین غوری نے مجھ سے پوچھا، یہ بادشاہ اچھے اخلاق و سیرت کا حامل تھا۔ اہل علم اور اہل دین و دانش سے اس کا گہرا لگاؤ تھا۔ اس نیک دل بادشاہ کے جواب میں میں نے ایک رسالہ لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

اس بحث کے چند مقدمات ہیں۔

پہلا مقدمہ:۔

اس کی دلیل ہم قائم کر چکے کہ جسموں کے مرنے کے بعد ان کی روحیں زندہ رہتی ہیں...... اور یہ روحیں ان روحوں سے جو ابھی جسموں میں ہیں، بعض حیثیتوں سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں اور بعض چیزوں میں یہ جسموں والی روحیں زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔ جسموں سے آزاد روحیں اس طرح زیادہ طاقتور ہوتی ہیں کہ یہ روحیں جب اپنے جسموں سے جدا ہوگئیں تو ان کا پردہ ہٹ گیا۔ اور ان کے لئے عالم غیب اور منازل آخرت کے سربستہ راز کھل گئے اور ایسے بہت سے علوم جو دلائل سے معلوم ہوتے تھے اب ان روحوں کو یہ علوم بداہت اور مشاہدہ سے معلوم ہونے لگے کیوں کہ یہ روحیں جب تک جسموں میں تھیں، تو وہ گویا ایک برتن میں بند تھیں، جب بدن کی قید سے آزاد ہوگئیں تو ان میں ایک خاص قسم کی چمک اور درخشندگی پیدا ہوگئی۔ اس طرح ان آزاد ہونے والی روحوں کے اندر ایک خوبی اور کمال پیدا ہوگیا اور جسموں سے وابستہ روحیں اس اعتبار سے زیادہ طاقتور ہیں کہ فکر و نظر کے ذریعہ اکتساب وطلب کے آلات ان روحوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ روحیں ہر روز ایک نیا تجربہ حاصل کرتی ہیں اور جسموں سے آزاد روحوں کو یہ چیزیں میسر نہیں۔

دوسرا مقدمہ:۔

روحوں کا اپنے جسموں سے شدید عشق اور کامل محبت جیسا تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جو چیز بھی حاصل کی جاتی ہے وہ صرف اس لئے حاصل کی جاتی ہے کہ اس سے جسم کو آرام، راحت اور فائدہ حاصل ہوگا۔ جب انسان مرجاتا ہے اور اس کی روح اس کے جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو یہ میلان و رجحان اپنی جگہ باقی رہتا ہے اور روح کا جسم سے جو عشق تھا وہ بھی بحال رہتا ہے اور پھر اس روح کا اپنے بدن کی طرف میلان اور جھکاؤ اور زیادہ ہوجاتا ہے۔ اس کی بنیاد

ہمارا ثابت کردہ وہ نظریہ ہے جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ نفس ناطقہ جزئیات کا ادراک کرتا ہے اور نفس ناطقہ اپنے جسم سے جدا ہوجانے کے بعد بھی اپنے اندر ادراک کی قوت باقی رکھتا ہے۔

ان مقدمات کی وضاحت کے بعد عرض ہے کہ جب انسان ایک طاقتور اور بااثر روح والے انسان کی قبر پر جاتا ہے اور وہاں تھوڑی دیر کے لئے رکتا ہے تو اس کا نفس اس تربت سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور پہلے بتایا جاچکا کہ اس میت کی روح کا اس تربت سے ہمیشہ تعلق قائم رہتا ہے۔ ایسے میں ان دونوں کے یکجا جمع ہونے سے اس زیارت کرنے والے شخص کو اس صاحب قبر سے ایک طرح کی ملاقات ہوتی ہے اور یہ دونوں روحیں ان دو صاف وشفاف آئینے کی طرح ہو جاتی ہیں، جو اس طرح رکھے گئے ہوں کہ شعاعیں چھن کر ایک دوسرے کو پہنچ رہی ہوں۔ اللہ کے لئے خشوع وخضوع اور اس کے فیصلے پر راضی ہونے کے باعث جو علوم ومعارف اور اخلاق فاضلہ اس زائر کو ملتے ہیں، اس سے ایک نور نکل کر اس میت کی روح تک پہنچتا ہے اور اسی طرح اس میت کو جو روشن علوم حاصل ہوتے ہیں ان سے ایک نور نکل کر اس زائر کی روح تک پہنچتا ہے اور اس طرح زیارت کرنے والے اور صاحب قبر کی روحوں کو اس زیارت سے ایک عظیم نفع اور زبردست سرور نصیب ہوتا ہے۔ یہی زیارت قبر کے مشروع ہونے کا اصلی سبب ہے۔

اور یہ بھی بعید نہیں کہ اس سے بھی کچھ زیادہ رازہائے سربستہ حاصل ہوتے ہوں، جن کا صحیح علم صرف وحدہ لاشریک کے پاس ہے۔

یہ امام فخر الدین رازی کا نظریہ ہے، جس میں انہوں نے واضح فرمایا کہ زیارت میں زائر اور صاحب قبر کے مراتب کے تناسب سے اخذ واستفادہ اور عطا وافادہ کا سلسلہ باہم پایا جاتا ہے۔

(۷) علامہ محقق سعد الدین تفتازانی "شرح المقاصد" کی دوسری جلد ص ۳۷ پر فلاسفہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں (یہ کتاب اصول عقائد کی بنیادی کتابوں میں ہے)

فلاسفہ کے یہاں جزئیات کے ادراک کے لئے آلات وذرائع میں صورت کا حاصل ہونا شرط ہے۔

جب بات یہ ٹھہری تو روح کے جسم سے جدا ہو جانے اور ذرائع و آلات کے ناپید ہو جانے کے بعد نفس میں جزئیات کے لئے قوت ادراک باقی نہیں رہ جاتی کیوں کہ جب شرط نہ رہی تو مشروط بھی نہ رہا۔

ہم جواب دیں گے ہمارے یہاں جزئیات کے ادراک کے لئے آلات و ذرائع شرط نہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ادراک نفس میں یا حواس میں حصول صورت کا نام نہیں یا پھر اس لئے کہ جزئی کی صورت کا نفس میں مرتسم ہونا محال نہیں...... بلکہ اسلامی اصول سے تو یہی ظاہر ہے کہ جسم کے روح سے جدا ہو جانے کے بعد بھی روح کو جزئی قسم کے ادراکات اور زندوں کے حالات کے جزئیات پر اطلاع ہوتی ہے۔ خصوصاً میت کا جن سے تعارف اور لگاؤ ہوتا ہے ان کے حالات سے اس میت کو آگاہی ہوتی ہے اسی لئے زیارت قبور سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اور بھلائیوں کے حصول اور مصیبتوں کے ازالہ کے سلسلے میں وفات یافتہ بزرگوں کی روحوں سے مدد بھی لی جاتی ہے۔ اس لئے روح کے جسم سے جدا ہو جانے کے بعد اس جسم اور خاک سے جہاں یہ جسم مدفون ہوا ہے، ایک طرح کا تعلق باقی رہتا ہے۔

جب یہ زیارت کرنے والا اس خاک پر آتا ہے اور اس کی روح اس صاحب قبر کی روح کے قریب آتی ہے، تو دونوں روحوں کے درمیان ایک قسم کی ملاقات اور فائدہ رسانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں علامہ تفتازانی کی یہ تحقیق ہے۔

کیا علامہ تفتازانی بھی ان لوگوں میں سے ہو سکتے ہیں جو توحید اور شرک کے درمیان تمیز نہیں رکھتے؟ ایسا خیال رکھنے والے ذہن کا بُرا ہو۔

(۸) مزید علامہ تفتازانی اسی جلد کے ص۱۵۰ پر رقم طراز ہیں۔

الحاصل! اولیائے کرام سے کرامات کا ظہور تقریباً اسی قدر ہے جتنا کہ انبیائے کرام سے معجزات کا ظہور رہا ہے۔

بدمذہب اگر اس کا انکار کرتے ہیں تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں، کیوں کہ انہوں نے عبادت کے کاموں کی بجا آوری اور برائیوں سے اجتناب میں سرگرمی و کوشش کے باوجود نہ تو اپنے

اندر کسی کرامت کا مشاہدہ کیا، نہ اپنے کو برتر و بالا سمجھنے والے اپنے پیشواؤں کے بارے میں ایسا کچھ سنا اس لئے سرے سے کرامات اولیاء ہی کا انکار کر بیٹھے اور ان کی بدگوئی اور غیبت پر اتر آئے۔ صالحین کی کھال چاک چاک کرنا اور ان کا گوشت چبانا ہی مشغلہ بن گیا۔ ان کو جاہل صوفیہ کے لقب سے یاد کرنا اور ان کو اہل بدعت میں شمار کرنا ہی شیوہ ٹھہرا۔ یہ اپنی مسلسل غیبت گوئی کی وجہ سے اس مثل کے مصداق ہیں اوسعتھم ستا و اودوا بالابل انہیں پتہ نہیں کہ حصول کرامت کی بنیاد، عقیدہ کی درستی، باطن کی صفائی، طریقت کی پیروی اور حقیقت کی برگزیدگی پر قائم ہے۔

اولیائے کرام کے سلسلہ میں یہ اس محقق کا ارشاد ہے جن کا تصوف سے تعلق نہ تھا...... اولیائے کرام کی آبروریزی کرنے والوں کے لئے اس بیان میں عبرت کا سامان موجود ہے۔

(۹) علامہ سید شریف جرجانی حاشیہ "مطالع" میں فرماتے ہیں نبی ﷺ پر کتابوں کے شروع میں درود لکھنے اور فیض یابی کے لئے عظیم ہستیوں کا وسیلہ لینے کی وجہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں...... اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ بڑی شخصیتوں کا وسیلہ بس ان کی ظاہری زندگی ہی تک محدود ہے، ان کے جسموں سے روحوں کے رخصت ہونے کے بعد توسل کی گنجائش نہیں۔

تو ہم جواب دیں گے توسل اور فیض یابی کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ پاکیزہ ہستیاں اس دنیا کے اندر اپنے جسموں سے تعلق قائم رکھتے ہوئے اپنی زبردست ہمت و عزیمت کے ساتھ ناقص افراد کی تکمیل میں مصروف رہ چکی ہوں۔ بعد وفات بھی ان کے اندر اس کا اثر باقی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزارات کی زیارت زائرین کے لئے منبع انوار ثابت ہوتی ہے...... جس کا اصحاب نظر مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

غرض اس مسئلہ میں کتاب وسنت، عمل امت، دستور مسلمین اور ائمہ دین سب متفق ومتحد ہیں۔ اس کے باوجود جو انکار وعناد پر آمادہ ہو وہ راہ حق سے منحرف ہے۔

اب ہم ذیل میں اس سلسلہ کی احادیث وروایات پیش کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے آیات وسیلہ کا مفہوم واضح کرتے چلیں۔

(۱) **يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ** (مائدہ:۳۵)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کی بارگاہ کے لئے وسیلہ لاؤ۔

اس میں شخصیت اور عمل دونوں کا وسیلہ مطلوب ہے اس لئے کہ وسیلہ ان دونوں چیزوں کو شامل ہے...... یہ استدلال نہ تو محض رائے سے ہے، نہ صرف عموم لغوی کے تحت ہے، بلکہ اس کے حق میں واضح روایتیں بھی موجود ہیں۔

ابن عبدالبر نے "استیعاب" میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ حضرت عمر نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بارش ہونے کے لئے وسیلہ لیا تھا اور ان کے وسیلہ سے بارش ہوئی تھی۔ اس کے بعد حضرت عمر نے فرمایا تھا۔

هٰذَا وَاللّٰهِ الْوَسِيْلَةُ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالْمَكَانُ مِنْهُ

حضرت عباس اللہ کی بارگاہ کے وسیلہ اور صاحب مرتبہ ہیں۔

حضرت عمر کے ارشاد کا ایک اور حصہ "فتح الباری" میں اس طرح آیا ہے۔

حضرت عمر نے فرمایا:

وَاتَّخِذُوْهُ (يَعْنِى الْعَبَّاسَ) وَسِيْلَةً اِلَى اللّٰهِ

لوگو ان (حضرت عباس) کو خدا کی بارگاہ کے لئے وسیلہ بناؤ۔

اگر کہا جائے کہ فاروق اعظم کے ارشاد "اِتَّخِذُوْهُ وَسِيْلَةً" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عباس سے دعا کراؤ تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں اس معنی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمر ان سے دعا کی درخواست تو پہلے ہی کر چکے تھے جس پر انہوں نے آگے بڑھ کر دعا بھی کی۔ اس کے بعد حضرت عمر کے فرمان "اِتَّخِذُوْهُ وَسِيْلَةً" کا یہی معنی ہوگا کہ ان کو خدا کی بارگاہ میں وسیلہ بناؤ جیسا کہ خود حضرت عمر نے اپنے عمل سے [illegible] واضح کیا تھا۔ وَلٰكِنَّ الْهَوٰى يُعْمِىْ وَيُصِمُّ

فتح الباری میں منقول ہے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ "لوگ آپ کا وسیلہ لایا کرتے تھے۔" اس میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ انہوں نے حضور سے درخواست کی ہو کہ حضور ان کے لئے بارش طلب کریں۔ اس لئے کہ دونوں شکلوں میں

اس کا امکان ہے کہ خود صحابہ کرام نبی ﷺ کا وسیلہ لا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دعا کرتے تھے۔

ابن رشید نے تو اپنے اس قول سے ساری بحث ہی کا خاتمہ کر دیا ان کا کہنا ہے کہ:۔

عنوان باب:

بَابُ سُؤَالِ النَّاسِ الْاِمَامَ الْاِسْتِسْقَاءِ

لوگوں کا امام سے استسقاء کے لئے درخواست کرنے کا باب۔

مقصد یہ بتانا ہے کہ جب لوگ حضور کو وسیلہ بنا کر خود اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے اور وہ بارش نازل فرماتا تو اگر خود حضور ہی کو دعا کے لئے آگے بڑھائیں تو یہ بدرجہ اولیٰ درست اور مناسب ہوگا۔

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ نبی ﷺ وسیلہ ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے دعا کرائی جائے۔ ایسے لوگوں کا خیال ان دونوں محققین کے قول سے غلط ہو کر رہ جاتا ہے کہاں وسیلہ لینا، اور کہاں دعا کرانا۔

ہاں! کبھی یہ ہوتا ہے کہ جس کا وسیلہ لیا جاتا ہے وہ وسیلہ لینے والے کے لئے دعا بھی کرتا ہے لیکن یہ توسل کا لغوی یا شرعی معنی ہرگز نہیں۔

نبی کریم ﷺ کا وسیلہ حق ہے۔ درج ذیل آیت کریمہ کے تحت تفسیر علامہ بغوی وغیرہ میں یہ روایت آئی ہے۔

(۲) وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ۔ (البقرۃ:۸۹)

یعنی اہل کتاب یہود نبی ﷺ کے وسیلہ سے اہل کفر کے مقابلہ میں فتح مانگا کرتے مگر جب یہ نبی ﷺ تشریف لائے تو یہ انکار کر بیٹھے۔

یہود پر جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تو یہ دعا کرتے۔

اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلَيْهِمْ بِالنَّبِيِّ الْمَبْعُوْثِ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ الَّذِىْ نَجِدُ صِفَتَهٗ فِي التَّوْرَاةِ فَكَانُوْا يَنْصُرُوْنَ

اے اللہ! دشمن پر ہماری مدد فرما اس نبی ﷺ کے وسیلہ سے جو آخری زمانہ میں مبعوث ہونے والے ہیں۔ جن کی صفت ہم تورات میں پاتے ہیں۔

چنانچہ یہود اس طرح دعا کرتے تو ان کو فتح و نصرت حاصل ہوتی۔

اس سلسلہ کی مکمل روایتیں "الدر المنثور" از سیوطی میں مرقوم ہیں۔

درج ذیل آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کا وسیلہ بالکل واضح ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (النساء:۹)

ترجمہ:۔ اگر وہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کریں، پھر آپ کے پاس آئیں اور اللہ سے مغفرت کا سوال کریں، اور آپ بھی ان کے لئے بخشش مانگیں تو یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے۔

اس کے بارے میں اگر کوئی یہ کہے کہ حضور کا یہ وسیلہ آپ کی ظاہری زندگی ہی تک محدود تھا تو یہ بات بلا دلیل، بلکہ خواہش نفس کی پیروی ہوگی۔

مطلق اپنے اطلاق پر ہی ہوگا۔ اس پر اہل حق کا اتفاق ہے۔ مطلق کسی دلیل ہی سے مقید ہوگا اور اس جگہ کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس مطلق کو مقید بنا سکے۔

اس آیت کے سلسلے میں سارے مذاہب کے فقہاء حتی کہ حنبلی حضرات بھی اس بات کے قائل ہیں کہ آیت بعد وفات کے زمانہ کو بھی شامل ہے اور انبیاء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

حنبلی حضرات کے نزدیک زیارت قبر انور کے وقت توسل کے الفاظ کیا ہیں؟...... یہ قدیم حنبلی بزرگ ابو الوفاء بن عقیل کی کتاب "التذکرہ" سے ہم نے ابن قیم کے قصیدہ نونیہ کے رد "السیف الصقیل" کے تکملہ میں ذکر کیا ہے۔ ان کے الفاظ توسل میں مذکورہ آیت کریمہ اور سرکار سے توسل دونوں موجود ہیں...... جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی آیت بالا سے توسل کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

عتبی کی حدیث میں بھی اس آیت کریمہ کو ذکر کر کے سرکار سے توسل کا واقعہ موجود

ہے۔ اس روایت کو محض زور قلم سے رد نہیں کیا جاسکتا۔

اب ہم وہ روایات و احادیث پیش کر رہے ہیں، جن میں وسیلہ واضح الفاظ میں موجود ہے۔ سابقہ صفحات میں احادیث کی جانب جو اجمالی اشارہ کیا گیا ہے اب اس کی تفصیل کے لئے ہم یہاں کچھ احادیث اور آثار پیش کر رہے ہیں جن سے واضح طور پر وسیلہ لینے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

(۱) بخاری نے استسقاء کے بیان میں روایت کی ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معمول تھا کہ جب قحط پڑتا تو آپ حضرت عباس بن عبد المطلب کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے بارش کا سوال کرتے...... ان کے الفاظ یہ ہوتے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَسْقِيْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا قَالَ فَيُسْقَوْنَ

اے اللہ! ہم پہلے اپنے نبی ﷺ کے وسیلے سے بارش کا سوال کرتے تھے، اور تو ہم پر بارش نازل کرتا تھا اور اب ہم اپنے نبی کے چچا کے وسیلہ سے بارش کا سوال کر رہے ہیں، اے رب! ہم پر اس وسیلہ سے بارش نازل فرما، راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد بارش ہوا کرتی۔

اس حدیث میں شخصیت کا وسیلہ واضح الفاظ میں موجود ہے۔ اس روایت کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ عبارت اصل میں یہ ہے "بِدُعَاءِ عَمِّ نَبِيِّنَا" یہ مطلب غلط اور بے بنیاد ہے اس کی کوئی دلیل نہیں۔

اسی طرح یہ کہنا کہ نبی ﷺ کی وفات کے باعث آپ کا وسیلہ ترک کیا گیا اور حضرت عباس کا وسیلہ لیا گیا...... یہ ایک ایسی بات ہوگی جو حضرت عمر کے حاشیہ خیال میں بھی نہ گزری ہوگی بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برتر کے ہوتے ہوئے بھی کمتر سے وسیلہ لیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح "بِعَمِّ نَبِيِّنَا" کے الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو وسیلہ لیا گیا ہے وہ حضرت عباس کے رشتہ نبی ﷺ کا ہی وسیلہ ہے اور حضور کے یہاں جو ان کا رتبہ تھا، اس کا وسیلہ ہے جو

در حقیقت نبی ﷺ ہی کا وسیلہ ہے۔

حدیث کا دوسرا لفظ "کُنّا" یہ صرف عہد نبی ﷺ ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس کے بعد عام رمادہ تک کے زمانہ کو بھی شامل ہے، اس لئے اس کو عہد نبی ﷺ کے ساتھ مقید کرنا بلا دلیل ہے۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تو بخاری کی روایت کے مطابق ابو طالب کا یہ شعر بھی سنایا کرتے تھے۔

وَابۡيَضُ يُسۡتَسۡقَى الۡغَمَامُ بِوَجۡهِهٖ

آپ روشن و سفید رو ہیں آپ کے چہرہ انور کے وسیلہ سے بارش مانگی جاتی ہے۔

بلکہ فتح الباری کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے خود یہ شعر پڑھنے کی فرمائش کی ہے۔

اسی طرح حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس شعر میں وسیلہ سے کون انکار کرسکتا ہے۔

"فَسَقَى الۡغَمَامُ بِغُرَّةِ الۡعَبَّاسِ" (استعاب)

تو بادلوں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرۂ مبارک کے وسیلہ سے بارش برسائی۔

ان سب روایات و اشعار میں یہ حقیقت بالکل آشکار ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت اور رب تعالیٰ کے یہاں ان کا جو رتبہ ہے اس کے وسیلہ سے خدا سے بارش کا سوال کیا گیا۔

(۲) بیہقی نے مالک الدار سے روایت کی ہے اس روایت میں صاف ہے کہ حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عہد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں نبی ﷺ کی ذات اقدس کا وسیلہ لیا تھا۔

مالک الدار اضافت کے ساتھ، حضرت عمر کے مولیٰ اور خازن تھے۔ حضرت عمر نے ان کو بے سہارا لوگوں کا انتظام سونپا تھا۔ حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو تقسیم کی ذمہ داری عطا کی تھی، اس لئے ان کا نام مالک الدار ہو گیا۔ (طبقات سعد و اصابہ)

معارف بن قتیبہ میں ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خدام میں ایک مالک الدار

بھی تھے۔ حضرت عمر نے ان کو ایک گھر سونپا تھا، جس میں وہ لوگوں کو کچھ بانٹا کرتے تھے۔ وسیلہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

اَصَابَ النَّاسَ قَحۡطٌ فِيۡ زَمَانِ عُمَرَ بۡنِ الۡخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ فَجَآءَ رَجُلٌ اِلٰى قَبۡرِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ : يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ اِسۡتَسۡقِ اللّٰهَ لِاُمَّتِكَ فَاِنَّهُمۡ قَدۡ هَلَكُوۡا فَاَتَاهُ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الۡمَنَامِ فَقَالَ ائۡتِ عُمَرَ فَاَقۡرِئۡهُ السَّلَامَ وَ اَخۡبِرۡهُ اَنَّهُمۡ يُسۡقَوۡنَ (الحدیث)

عہد عمر میں لوگ قحط کے شکار ہوئے۔ ایک شخص نبی ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! اپنی امت کے لئے رب تعالیٰ سے بارش کی دعا فرما دیں، لوگ تباہ ہو رہے ہیں۔ نبی ﷺ خواب میں اس شخص کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم عمر کے پاس جاؤ اور ان کو سلام کہو اور خبر کردو کہ اب بارش ہوگی۔

اس حدیث سے یہ چند باتیں ثابت ہوتی ہیں......!

(۱) نبی ﷺ سے ان کی برزخی زندگی میں بارش کے لئے سوال کیا جا سکتا ہے۔

(۲) رب تعالیٰ سے آپ ﷺ دعا کر سکتے ہیں۔

(۳) آپ ﷺ سے اگر کوئی ایسی گزارش کرتا ہے تو آپ ﷺ کو اس کا علم ہوتا ہے۔

(۴) اس شخص کے اس طرز عمل پر کسی صحابی نے کوئی اعتراض نہ کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے۔

یہ حدیث امام بخاری نے اپنی تاریخ میں مختصراً ابو صالح ذکوان کے واسطے سے روایت کی ہے...... "اصابہ" کی تصریح کے مطابق حدیث ابن ابو خیثمہ نے اسی واسطے سے تفصیل کے ساتھ روایت کی ہے۔ ابن حجر نے وضاحت کی ہے کہ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث ابو صالح سمان کے واسطہ سے مالک الدار سے روایت کی ہے۔

ابن حجر نے مزید وضاحت کی ہے کہ مذکورہ خواب ایک دوسرے صحابی بلال بن حارث

مزنی نے دیکھا تھا جیسا کہ سیف نے "فتوح" میں روایت کی ہے۔

پیارے نبی ﷺ کے رحلت فرمانے کے بعد آپ کے وسیلہ سے دعائے بارش کے سلسلے میں یہ حدیث عمل صحابہ پر کھلی ہوئی دلیل ہے کیوں کہ اس پر کسی صحابی کو کوئی اعتراض نہ ہوا جب کہ صحابہ اس سے باخبر اور آگاہ تھے، اس لئے کہ جو معاملہ امیر المومنین تک پہنچ جاتا ہے، وہ ڈھکا چھپا نہیں رہ جاتا، معروف و مشہور ہو جاتا ہے...... اس طرح یہ حدیث منکرین وسیلہ کی مکمل طور سے زبان بند کر دیتی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اور روایت عثمان بن حنیف رضی اللہ تعالی عنہ کی حدیث ہے۔ نبی ﷺ نے بذات خود ان کو ایک دعا بتائی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡاَلُکَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیۡکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحۡمَةِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیۡ تَوَجَّهۡتُ بِکَ اِلٰی رَبِّیۡ فِیۡ حَاجَتِیۡ هٰذِهٖ لِتُقۡضٰی لِیۡ حَاجَتِیۡ

اے اللہ! میں تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اور تیرے نبی محمد رحمت کے نبی کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں...... یارسول اللہ میں آپ کا وسیلہ لاکر اپنی اس ضرورت کو لے کر اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوا تاکہ میری ضرورت پوری ہو جائے۔

اس حدیث سے یہ باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) نبی ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کے جاہ عالی کا وسیلہ حق ہے۔

(۲) آپ کو دور سے پکارنا اور ندا دینا بھی حق ہے۔

منکرین وسیلہ کے لئے یہ روایت بھی تازیانہ عبرت ہے۔ یہ حدیث بخاری نے "تاریخ کبیر" میں، ترمذی نے "جامع دعوات" میں، ابن ماجہ نے "سنن" صلاۃ الحاجۃ میں روایت کی ہے...... اور ساتھ ہی ابن ماجہ نے اس روایت کے صحیح ہونے کی تصریح بھی کی ہے۔ نسائی نے "عَمَلُ الۡیَوۡمِ وَاللَّیۡلَةِ" میں، ابونعیم نے "معرفۃ الصحابہ" میں، بیہقی نے "دلائل النبوۃ" میں اور

ان کے سوا اور بھی کئی محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں یہ روایت نقل کی ہے...... اس کے علاوہ تقریباً پندرہ حفاظ و محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ متاخرین کے علاوہ ان محدثین میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں: ترمذی، ابن حبان، حاکم، طبرانی، ابونعیم، بیہقی اور منذری...... ترمذی کی سند اس طرح ہے۔ (ج ۲ ص ۱۹۷ مطبوعہ رشیدیہ، دہلی)

حَدَّثَنَا مَحۡمُوۡدُ بۡنُ غَیۡلَانَ حَدَّثَنَا عُثۡمَانُ بۡنُ عُمَرَ حَدَّثَنَا شُعۡبَةُ عَنۡ اَبِیۡ جَعۡفَرَ عَنۡ عِمَارَةَ بۡنِ خُزَیۡمَةَ بۡنِ ثَابِتٍ عَنۡ عُثۡمَانَ بۡنَ حَنِیۡفٍ (الحدیث)

ترمذی نے اس حدیث کو صحیح حسن غریب بتایا ہے۔ مزید فرماتے ہیں، یہ حدیث ہمیں صرف ابوجعفر خطمی کے واسطے سے پہنچی ہے۔ ابوجعفر کے بارے میں ترمذی کے کسی نسخہ میں "وھو غیر الخطمی" اور کسی میں "لیس ھو الخطمی" کے الفاظ بھی ملتے ہیں اور یہ سب ناقلوں کے تصرفات ہیں، کیونکہ امام ترمذی کا یہ طریقہ نہیں کہ کسی کے بارے میں یہ کہیں کہ فلاں فلاں اور اس کی تفصیل سے وضاحت نہ کریں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ابوجعفر جنہوں نے عمارہ سے روایت کی ہے یہ عمیر بن یزید خطمی ہی ہیں جو اصلاً مدنی ثانیاً بصری ہیں جیسا کہ رجال کی مشہور مطبوعہ اور مخطوطہ کتابوں سے ظاہر ہے۔

اور ابوجعفر رازی متوفی ۱۶۰ھ جو شعبہ کے مشائخ میں سے ایک ہیں، انہوں نے عمارہ متوفی ۱۰۵ھ کا زمانہ قطعاً نہیں پایا...... اس لئے کہ ابوجعفر رازی کا سفر حجاز، عمارہ کی وفات کے ۹ سال بعد وقوع پذیر ہوا اور شعبہ اپنی روایتوں میں قوی اور قابل اعتبار ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ طبرانی وغیرہ کے نزدیک حدیث کے دیگر واسطے بھی اصل سند سے ہی اس کی تائید کر دیتے ہیں کہ یہ ابوجعفر وہی خطمی ہیں جو متفقہ طور پر ثقہ ہیں، اس حدیث کی سند بحوالہ طبرانی "شفاء السقام" از تقی سبکی میں مذکور ہے۔

ترمذی کی سند کے سارے ہی راوی ثقہ اور معتبر ہیں اور ترمذی کی اس حدیث کو غریب کہنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ سند میں عثمان بن عمر بروایت شعبہ منفرد ہیں...... اور ابوجعفر بروایت عمارہ بھی منفرد ہیں، حالانکہ یہ دونوں ہی راوی بالاتفاق ثقہ ہیں اور ایسی کتنی ہی صحیح حدیثیں ہیں،

جن کے سلسلہ رواۃ میں کہیں کوئی راوی منفرد ہوتا ہے جیسا کہ حدیث "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات" میں بھی یہ انفراد پایا جاتا ہے...... اسی حدیث کو امام ترمذی نے "حسن" بھی کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابوجعفر اور عثمان بن عمر کے بعد اس کے واسطے متعدد ہیں۔ اسی کو ترمذی نے صحیح بھی کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے راویوں میں صحت کے اوصاف مکمل طور پر موجود ہیں۔

(۴) حضرت عثمان بن حنیف کی حدیث جس میں ایک شخص کو نماز حاجت کے ساتھ مذکورہ دعا کی تعلیم دی گئی ہے اس شخص کو امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک کام تھا۔ اس نے وہی دعا کی اور اس کا کام ہو گیا۔

اس مقام پر جس نکتہ کی نشاندہی کرنی ہے، وہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا صحابی نے دعائے حاجت کی حدیث سے یہی سمجھا کہ یہ دعا نبی ﷺ کی ظاہری زندگی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہ ہے حضور ﷺ کا وسیلہ...... اور یہ ہے حضور ﷺ کی رحلت کے بعد آپ کو پکارنا اور ندا کرنا...... اور یہ ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل...... طبرانی نے "معجم کبیر" میں یہ حدیث روایت کی ہے اور کئی واسطوں سے اس کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اسی طرح ابوالحسن ہیثمی نے "مجمع الزوائد" میں اس کا ذکر کرنے کے بعد اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ان سے پہلے منذری "الترغیب" میں اور ان سے پہلے ابوالحسن مقدسی، اسی حدیث کے صحیح ہونے کی تصریح کر چکے ہیں۔ ابونعیم نے بھی "المعرفۃ" میں اور بیہقی نے بھی دو واسطوں سے یہ حدیث روایت کی ہے اور ان کی دونوں ہی سندیں صحیح ہیں۔

(۵) وسیلہ کی احادیث میں فاطمہ بنت اسد کی حدیث بھی ہے جس میں خود رسول اللہ ﷺ کے فرمائے ہوئے یہ الفاظ موجود ہیں۔

بِحَقِّ نَبِیِّکَ وَالْاَنْبِیَاءِ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِیْ

تیرے نبی کے اور مجھ سے پہلے انبیاء کے وسیلہ سے۔

ابن حبان اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔ طبرانی نے "کبیر" اور "اوسط" میں یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس کی سند میں روح بن صلاح ہیں جن کو ابن حبان اور حاکم نے ثقہ قرار

دیا ہے۔ ان کے علاوہ سارے ہی راوی صحیح بخاری کے رواۃ سے ہیں۔

اس حدیث میں وفات پانے والے انبیائے سابقین علیہم السلام کا وسیلہ کھلے الفاظ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(۶) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

لَمَّا اقْتَرَنَ اٰدَمُ الْخَطِیْئَۃَ قَالَ یَارَبِّ اَسْأَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لِمَا غَفَرْتَ لِیْ

حضرت آدم علیہم السلام نے لغزش کے بعد بارگاہ خدا میں عرض کیا، اے میرے پروردگار! محمد ﷺ کے وسیلہ سے مجھے بخش دے۔

حاکم نے "مستدرک" میں یہ حدیث روایت کرنے کے بعد فرمایا ہے، اس حدیث کی سند صحیح ہے مزید فرمایا: عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے مروی یہ پہلی حدیث میں نے ذکر کی ہے...... تقی سبکی نے "شفاء السقام" میں اس کی پوری سند ذکر کی ہے۔ طبرانی نے "اوسط" اور "صغیر" میں اس روایت کی تخریج کی ہے اور ان کی دونوں روایتوں میں بعض ایسے راوی پائے جاتے ہیں جن سے ہیثمی واقف نہیں۔

ہاں! عبدالرحمٰن بن زید کو امام مالک نے اور ان کی متابعت میں کچھ اور حضرات نے ضعیف قرار دیا ہے۔ پھر بھی ان پر کذب کی تہمت نہیں، بلکہ ان پر صرف وہم کا الزام ہے۔

اور ایسے راویوں کی روایتیں چھان بین کے بعد قبول کر لی جاتی ہیں۔ حاکم نے ایسا ہی کیا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس حدیث کو امام مالک نے خود قبول فرمایا جیسا کہ ابن حمید امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالک نے ابوجعفر منصور سے فرمایا۔

هُوَ وَسِیْلَتُکَ وَوَسِیْلَۃُ اَبِیْکَ اٰدَمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ

محمد ﷺ تمہارا بھی وسیلہ ہیں، اور تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی وسیلہ ہیں۔

اب جب امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس کو بطور دلیل پیش کر دیا تو عبدالرحمٰن راوی کے اوپر سے وہم اور قلت حفظ کا الزام ختم ہو گیا...... کیوں کہ دوسرے الزام دینے والوں نے امام مالک کی تبعیت ہی میں الزام دیا ہے۔ اس کے علاوہ

عبدالرحمٰن بن زید ایسے محدث نہیں جن کی روایت مطلقاً مسترد کر دی جائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر امام نے "الام" اور "مسند" میں ان کی روایت کردہ حدیث سے (فضائل میں نہیں) بلکہ احکام میں استدلال کیا ہے...... ایسی صورت میں حاکم نے مذکورہ حدیث کو اگر صحیح قرار دیا تو وہ باعث ملامت نہیں۔ یہ حدیث بلا شک وشبہ صحیح ہے۔ ہاں! جن کے سینے فضائل مصطفیٰ ﷺ سے تنگ ہوں وہ تو اس کی صحت سے انکار ہی کرتے رہیں گے۔

امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مذکورہ ارشاد قاضی عیاض نے "الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ" میں عمدہ سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(۱) اس روایت کی سند میں جو ابن حمید مذکور ہیں وہ محمد بن حمید رازی ہیں، یہی راجح ہے، وہ نہیں جو امام تقی الدین سبکی کا گمان ہے لیکن ان رازی کا حال ایسا نہیں جیسا کہ شمس بن عبدالہادی نے تصویر کشی کی کوشش کی ہے۔ شمس بن عبدالہادی نے ان کے ساتھ ناروا سلوک یہ کیا ہے کہ ان پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں وہ سب جمع کر دی ہیں اور ان کی تعریفوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ابن عبدالہادی ان تین میں سے ایک ہیں جو عالم شباب میں ابن تیمیہ سے ملے اور ان سے **فریب خوردہ ہو کر راہ مستقیم سے ہٹ گئے۔** جو دلائل ان کے شیخ ابن تیمیہ کے خلاف پڑتے ہیں، ان میں یہ صاحب **"جرح" کا ذکر کرتے ہیں اور "تعدیل" کو گول کر جاتے ہیں۔**

یہ محمد بن حمید وہ ہیں جن سے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین جیسے ائمہ حدیث نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ابن ابوخیثمہ بیان کرتے ہیں، رازی کے بارے میں **ابن معین سے پوچھا گیا** تو انہوں نے فرمایا، ثقہ اور دانشمند ہیں۔ ان سے استناد کرنے (سند لینے) میں کوئی حرج نہیں۔

امام احمد نے فرمایا "ری" میں اس وقت تک علم ہوگا جب تک محمد بن حمید ہوں گے۔ ابن حمید وہ ہیں جن کی صاغانی اور ذہلی نے بھی تعریفیں کی ہیں...... خلیلی "الارشاد" میں رقمطراز ہیں ابن حمید علم حدیث کے عالم اور حافظ ہیں۔ احمد اور یحییٰ نے ان کو پسند کیا۔ امام بخاری نے فرمایا "فیہ نظر"...... لیکن اس جیسی حدیث کے سلسلے میں وہ متہم نہیں۔ لمبی عمر پا کر ۲۴۸ھ میں رحلت

فرمائی۔ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصال کے وقت ان کی عمر پندرہ سال سے کم نہ تھی، جب کہ یہ لوگ اپنے امام کی "مسند" میں پانچ سال کے راوی کی روایت بھی قبول کرتے نظر آتے ہیں۔

(۲) یعقوب بن اسحاق کے بارے میں خطیب نے تاریخ میں کہا "لا باس بہ" ان میں کوئی حرج نہیں۔

(۳) ابوالحسن عبداللہ بن محمد بن منتاب، اسماعیل قاضی کے بڑے اصحاب میں سے ایک ہیں۔ ان کو تقریباً ۳۰۰ھ میں مقتدر نے مدینہ کا قاضی مقرر کیا تھا اور اس زمانہ میں غیر ثقہ عالم مدینہ منورہ کا قاضی نہیں ہو سکتا تھا۔

(۴) اور ان کے شاگرد محمد بن احمد بن فرج کی سمعانی نے "الانساب" میں ذکر جزاءری کے تحت توثیق کی ہے۔ ابن اثیر نے "اللباب" میں اس توثیق کو برقرار رکھا ہے۔

(۵) ابوالحسن فہری بھی یقیناً ثقہ ہیں۔ "العبر" از ذہبی میں ان کا تذکرہ موجود ہے۔

(۶) ابن دلہاث ابن عبدالبر کے ثقہ مشائخ میں سے ایک ہیں۔ "صلہ" ابن سکوال مطبوعہ مادریہ میں ان کا تذکرہ مرقوم ہے۔ راویوں کے جو تذکرے ہم نے اوپر پیش کیے ہیں، تقریباً اسی انداز سے سبکی نے "شفاء السقام" میں قلمبند کیا ہے۔

ابن عبدالہادی اس حدیث کے قبول کرنے سے صرف اس لئے انکار کرتے ہیں کہ یہ روایت ان کے شیخ ابن تیمیہ کے تفردات کے خلاف پڑتی ہے۔

ابن منتاب کے اس حدیث کے لانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اپنے شیخ قاضی اسماعیل مالکی کی "مبسوط" میں جو کچھ ہے اس کی تردید کر سکیں، جو ابن وہب بروایت مالک کے خلاف ہے۔ شیخ اسماعیل عراق کے ہیں اور اہل مدینہ اور اہل مصر عراقیوں سے زیادہ امام مالک کے مسائل سے آگاہ ہیں۔ ساتھ ہی اسماعیل نے امام مالک تک کی سند کا ذکر بھی نہ کیا، بلکہ اسے مرسلا بیان کر دیا ہے مگر چونکہ یہ ابن عبدالہادی کی خواہش کے مطابق ہے اس لئے انہوں نے بلاچون و چرا قبول کر لیا ہے اور ابن عبدالہادی ان کی مدح سرائی میں اس قدر رطب اللسان ہیں، جیسے ان کی

تعریف سند سے بے نیاز کردے گی۔ ایسا لگتا ہے قاضی اسماعیل کے بارے میں داؤد اصفہانی نے جونظریہ پیش کیا ہے اس پر ان کی نگاہ نہیں پڑی۔

ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ وسیلہ آدم کے سلسلہ کی ایک ہی روایت نہیں، بلکہ اس سلسلہ کی متعدد روایتیں اور بھی موجود ہیں جو ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ ہم یہاں ان کی تفصیلات میں اس لئے جانا مناسب نہیں سمجھتے کہ مذکورہ احادیث سنجیدہ اور غیر متعصب ذہن کے لئے کافی ہیں۔

(۷) ابن ماجہ نے اپنی سنن کے "باب المشئی الی الصلاۃ" میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کی ہے۔

مَنْ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهِ اِلَى الصَّلاةِ فَقَالَ اِنِّىْ اَسْاَلُکَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْکَ

(الحدیث)

جو شخص نماز کے ارادے سے گھر سے نکلے پھر یہ کہے اے اللہ! سوال کرنے والوں کا جو تیرے اوپر حق ہے، اس کے وسیلے سے میں سوال کرتا ہوں۔

شہاب بوصیری "مصباح الزجاجہ فی زوائد ابن ماجہ" میں فرماتے ہیں۔ اس سند کے راوی ضعیف ہیں...... مثلاً عطیہ، عوفی، فضیل بن مرزوق اور فضل بن موفق، یہ تینوں (یا چاروں؟) ضعیف ہیں، لیکن ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں فضیل بن مرزوق کے واسطے سے حدیث روایت کی ہے تو ان کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن رزین نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن منیع نے بھی اپنی "مسند" میں اس طرح یہ حدیث بیان کی ہے۔ حَدَّثَنَا فُضَيْلُ بْنُ مَرْزُوْقٍ

اس کے بعد پوری سند اور پوری روایت ذکر کی ہے......

علاء الدین مغلطائی "الاعلام شرح ابن ماجہ" میں فرماتے ہیں، یہ حدیث ابو نعیم، فضل ابن دکین نے "کتاب الصلوۃ" میں فضیل بن مرزوق سے، انہوں نے عطیہ سے، عطیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ سے موقوفاً روایت کی ہے۔ عطیہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ سے اس روایت میں تنہا نہیں، بلکہ ابو الصدیق بھی عبد الحکم بن ذکوان کی روایت

میں ان کے ساتھ ہیں۔ اور وہ ابن حبان کے نزدیک ثقہ ہیں۔ اگرچہ ابو الفرج نے اپنی "علل" میں ان پر تنقید کی ہے اور ابن سنی نے "عمل الیوم واللیلۃ" میں ایک ایسی سند کے ساتھ روایت کی ہے جس میں وازع نے بلال سے اس طرح روایت کی ہے۔ اَللّٰهُمَّ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْکَ

اس سند میں نہ عطیہ ہیں، نہ ابن مرزوق اور نہ ہی ابن موفق ہیں...... جس سے ظاہر ہوگیا کہ عطیہ ابن مرزوق، اور ابن موفق کو اگر ضعیف تسلیم بھی کرلیا جائے تو مذکورہ سندوں سے یہ امر واضح ہوگیا کہ وہ تینوں حضرات اس روایت میں منفرد نہیں بلکہ اس کی دوسری تائیدات بھی موجود ہیں...... علاوہ ازیں احمد بن منیع کے شیخ یزید بن ہارون بھی ابن مرزوق سے روایت کرنے میں ابن موفق کے شریک ہیں...... اسی طرح فضل بن دکین، ابن فضیل اور سلیمان بن حبان وغیرہم نے بھی ابن مرزوق سے روایت کی ہے۔ عطیہ پر تشیع کا الزام ہے لیکن امام ترمذی نے ان کی کئی روایتوں کو حسن قرار دیا ہے۔ ابن معین سے منقول ہے کہ وہ صالح ہیں۔ ابن سعد سے مروی ہے کہ ثقہ ہیں...... ابن عدی نے فرمایا ہے ان کی روایتیں صالح ہیں اور حضرت ابو سعید خدری کے نام کی صراحت کے بعد تدلیس کا احتمال نہیں، خصوصاً جب کہ اس روایت میں متابعت بھی ہے اور امام مسلم کے نزدیک ابن مرزوق کی توثیق کا پلہ بھاری ہے، کیوں کہ انہوں نے اپنی صحیح میں ان سے روایت کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مذکورہ حدیث بلال رضی اللہ تعالی عنہ کے واسطے سے بھی وارد ہوئی ہے...... اس لئے یہ حدیث تمام تر تنقیدات کے باوجود پایہ اعتبار اور درجہ استدلال سے فروتر ہرگز نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کا معاملہ صحیح اور حسن کے درمیان ہوگا، کیوں کہ یہاں متابعات اور شواہد کثرت سے پائے جارہے ہیں۔

ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ بعض حضرات کا قول ہے کہ جرح کو تعدیل پر ترجیح ہوتی ہے...... اس کے جواب میں عرض ہے کہ اولاً تو یہ قول ضعیف ہے، ثانیاً وہ بھی جرح کو تعدیل پر اس وقت ترجیح دیتے ہیں جب دونوں میں اس طرح تعارض ہو کہ دونوں کا پلہ بالکل برابر ہو۔ اس لئے جرح کی ترجیح کا معاملہ ثابت کرنے کے لئے پہلے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ یہاں جرح وتعدیل دونوں بالکل ہم پلہ ہیں...... اس کے بغیر مطلقاً جرح کی تقدیم کا فیصلہ صادر کرنا بہت دور کی بات

ہے اور زیر بحث حدیث کو تو حافظ عراقی نے تخریج احادیث احیاء اور حافظ ابن حجر نے "امالی الاذکار" میں حدیث حسن قرار دیا ہے۔ اس لئے اہل بدعت کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ مذکورہ اصول کا سہارا لے کر ان ثابت شدہ احادیث کو مسترد کرنے کی جسارت کریں، جو ایسے راویوں سے مروی ہوں جن کو محدثین کرام نے معتبر اور ثقہ قرار دیا ہے کیوں کہ ان حضرات کے نزدیک ان راویوں کے ثقہ ہونے ہی کے فیصلہ کو ترجیح حاصل تھی۔ زیر بحث حدیث کو محدث عراقی نے "تخریج احیاء العلوم" میں اور محدث ابن حجر نے "امالی الاذکار" میں حدیث حسن قرار دیا ہے۔

حدیث مذکورہ میں حق سائلین کے وسیلہ سے دعا کی تعلیم دی گئی ہے اور خدا سے سوال کرنے والوں میں خاص مقبول بندے بھی ہیں اور عام مسلمان بھی، اس لئے اس حدیث پاک سے عام مسلمین اور خاص مقبولان بارگاہ دونوں ہی سے وسیلہ لینے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

وسیلہ کے بعض منکرین اس حدیث سے متعلق یہ کہتے ہیں کہ "اَسْـأَلُکَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ کے اندر "بحق" میں جو "با" ہے وہ توسل کے معنی میں نہیں، بلکہ یہ وہ "با" ہے جو **"سال" کے مفعول ثانی پر آتی ہے۔**

ان کے جواب میں عرض ہے کہ سوال دو معنی میں آتا ہے:۔

(۱) پوچھنا، دریافت کرنا (۲) مانگنا طلب کرنا، عطاء و بخشش چاہنا۔

سوال کے دو مفعولوں میں سے ایک پر جو "با" آتی ہے وہ اس وقت ہوا کرتی ہے جب سوال پوچھنے اور دریافت کرنے کے معنی میں ہو...... جیسے قرآن میں ہے۔

فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝

تو اس کے بارے میں کسی خبر رکھنے والے سے پوچھ۔

سوال جب مانگنے اور دعا کرنے کے معنی میں ہو تو "با" متوسل بہ پر (اس پر جس سے وسیلہ لیا جائے) داخل ہوتی ہے جیسا کہ خود ماثورہ دعاؤں سے اس کی شہادت فراہم ہوتی ہے اور اگر خواہی نخواہی یہاں بھی یہی کہا جائے کہ "با" مفعول ثانی پر داخل ہے تو حدیث کے الفاظ مذکورہ کا معنی کیا ہوگا؟ "اَسْـأَلُکَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ" کا معنی اگر یہ لیں کہ "اَسْـأَلُکَ اِجَابَةَ

الْمُسْلِمِيْنَ" یعنی میں تجھ سے سائلوں کی اجابت اور قبول دعا کا سوال کرتا ہوں...... تو عرض یہ ہے کہ "حق" کا معنی اجابت اور قبولیت ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ "حق سائلین" سے مراد مَا يَسْتَحِقُّهٗ الخ۔

مَا يَسْتَحِقُّهُ السَّائِلُوْنَ الْمُتَضَرِّعُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَسُبْحَانَهٗ

خدا کے فضل و کرم سے یہ فروتنی و عاجزی کرنے والے سائل جس چیز کے مستحق ہوں وہی حق سائلین ہے۔

جب یہ ثابت ہے کہ حق کا معنی قبول و اجابت نہیں تو "بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ "اسالک کا مفعول ثانی ہو ہی نہیں سکتا اور کون حواس باختہ یہ بکواس کر سکتا ہے کہ نماز کو جانے والا یہ شخص سارے عام و خاص سائلان بارگاہ الٰہی کا حق خود وصول کرنا چاہتا ہے، اور اللہ سے اس کا سوال کر رہا ہے۔ منکرین وسیلہ کے خیال فاسد کی حقیقت اس وقت اور واضح ہو جاتی ہے جب بعد کے الفاظ بھی پیش نظر ہوں، اس جملہ کے بعد اس پر یہ جملہ معطوف ہے "وَاَسْاَلُکَ بِحَقِّ مَمْشَایَ هٰذَا الخ" کیا یہاں بھی وہ کہیں گے کہ بندہ دعا کر رہا ہے کہ میں اپنے اس چلنے کا حق مانگتا ہوں؟

منکرین اپنے خیال فاسد کی تائید کے لئے مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ سوال ہے تو کوئی مسئول و مطلوب ہونا ضروری ہے اور حق سائلین کے علاوہ حدیث میں اور کچھ مذکور ہی نہیں، جسے سوال کا مطلوب بنایا جا سکے، اس لئے وہی مطلوب ہے۔

ان کی یہ بات سخت مضحکہ خیز اور نہایت خندہ انگیز ہے گویا ان کو اَنْ تُعِيْذَنِيْ مِنَ النَّارِ نظر ہی نہیں آتا۔ حق سائلین اور اپنی پیادہ روی کے وسیلہ سے وہ یہی تو سوال کر رہا ہے کہ "مجھے دوزخ سے پناہ دے، میرے گناہوں کو بخش دے"...... یہ صراحت حدیث میں موجود ہے اور "اَسْـأَلُکَ" کی تکرار تاکید کے لئے ہے اور تاکید کے لئے فعل کی تکرار کوئی نادر چیز نہیں۔ کلام عرب میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں...... تو فعل اخیر سے جو مطلوب ہے وہی پہلے دونوں افعال سے بھی مطلوب ہے۔ بالفرض اگر یہ افعال تاکید والے نہ ہوتے تو بھی یہی مفعول اخیر سب کا مفعول بن جاتا۔ اور تمام افعال کا اسے معمول بنانے میں تنازع ہوتا، جو نحو اور زبان کا معروف

قاعدہ ہے......الحاصل !اس مفعول اخیر سے سابقہ افعال کا تعلق بہر تقدیر معتبر اور ملحوظ ہے۔

وسیلہ لینے کو ناجائز بنانے کے لئے کچھ لوگ یہ خیال فاسد قائم کرتے ہیں کہ غیر خدا کو بارگاہ خدا کے لئے وسیلہ بنانا غیر اللہ کی قسم کھانے کے مترادف ہے اور غیر اللہ کی قسم کھانا حرام ہے، اس لئے توسل بھی حرام ہے۔

اس خیال کے تحت توسل کی تردید کرنے والے درحقیقت مصطفیٰ ﷺ کی تردید کرنا چاہتے ہیں، اس لئے کہ خود سرکار مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء نے ہی توتوسل کے یہ الفاظ اور صیغے تعلیم فرمائے ہیں اور غیر خدا سے وسیلہ لیتے ہوئے دعا اپنی امت کو بتائی ہے۔ سرکار کے بتائے ہوئے کلمات اور دعاؤں میں اشخاص کا وسیلہ موجود ہے۔ افسوس کہ ان منکرین کو توسل اور قسم کے عظیم تفاوت کی بھی تمیز نہیں۔ کہاں غیر خدا کو بارگاہ خدا میں وسیلہ بنانا اور کہاں غیر خدا کی قسم کھانا؟

اس مقام پر ہم استعانت اور استغاثہ کے موضوع پر بھی مختصر گفتگو کرتے چلیں، تو کوئی حرج نہیں کیوں کہ یہ موضوع بھی وسیلہ سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ بخاری کی حدیث شفاعت کے الفاظ یہ ہیں۔

اِسْتَغَاثُوْا بِاٰدَمَ ثُمَّ بِمُوْسٰی ثُمَّ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

محشر کے دن لوگ حضرت آدم سے مدد مانگیں گے، پھر حضرت موسیٰ سے، پھر محمد ﷺ سے فریاد کریں گے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ توسل کے سلسلہ میں استغاثہ (فریاد خواہی) کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

رہی طبرانی کی روایت لَایُسْتَغَاثُ بِیْ کے الفاظ، اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہیں۔ ہم نے "الاشفاق" میں ان کا حال تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ روایت صحیح حدیث کے مقابل نہیں ہوسکتی۔

اب رہی یہ حدیث "وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ" ایک تو اس حدیث کی تمام سندوں میں کچھ ضعف پایا جاتا ہے، دوسرا یہ کہ اس کا حقیقی اور مجازی معنی یہ ہوگا۔

عِنْدَ اِسْتِعَانَتِکَ بِاَیِّ مُسْتَعَانٍ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ

کسی بھی مستعان سے مدد لینے کے وقت، خدا سے مدد طلب کرو۔

اس معنی کے تحت حدیث پاک سے استعانت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی سے بھی استعانت کی جائے تو مستعان حقیقی کو فراموش نہیں کرنا چاہئے اور صاحب ایمان کی شان یہی تو ہوتی ہے کہ وہ اسباب سے مدد لینے کے وقت مسبب الاسباب کو نہیں بھولتا۔

یہ دیکھیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب انہوں نے بارش کے لئے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وسیلہ لیا تو "اَللّٰھُمَّ فَاسْقِنَا" کے الفاظ کہنا نہ بھولے، اور یہی اسلامی ادب ہے۔

اگر حدیث کا یہ معنی نہ لیا جائے تو معنی مجازی لینا ہوگا اور متعدد آیات واحادیث کے خلاف ہوگا، ساتھ ہی حدیث کا لفظ اذا (جب) کلما (جب جب) کے معنی میں نہیں، بلکہ اہل منطق کے نزدیک یہ شرطیہ مہملہ کے الفاظ سے ہے۔ اس کے مطابق خصم کے لئے اس سے دلیل قائم کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ خطاب بھی واحد کے لئے ہے، یعنی ایک صحابی خاص کو مخاطب کر کے سرکار نے یہ فرمایا ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ خاص لوگوں کے لئے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی ایک خاص بندے ہیں، ایسے مقربان بارگاہ الٰہی کے لئے بہتر یہی ہے کہ یہ حضرات مسبب الاسباب اللہ سے مدد مانگا کریں۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنَ　　ہم تجھ سے ہی مدد مانگیں۔

یہ استعانت آیت کے سیاق وسباق کے مطابق عبادت اور ہدایت کے سلسلہ میں ہے۔ رب تعالیٰ سے مناجات کے دوران یہی مناسب بھی ہے اگر اس کا عام اور مطلق معنی لیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ بندہ کسی بھی کام میں کسی بھی غیر خدا سے مدد نہ لے جب کہ ہر شخص ہزار ہا دنیاوی معاملات میں برابر کسی نہ کسی سے مدد لیا کرتا ہے، اس لئے آیت کے معنی مطلق کو لے کر اگر مطلقاً استعانت کو شرک کہیں تو تقریباً سارے بندگان خدا کو مشرک قرار دینا اور اسباب دنیا کو معطل و بیکار کرنا لازم آئے گا۔

ہمارے ایک مخلص دوست صاحب تصانیف مفیدہ علامہ شیخ محمد حسنین عدوی مالکی رحمتہ

اللہ تعالیٰ علیہ نے زیر بحث موضوع وسیلہ پر متعدد کتابیں تالیف کی ہیں اور ان میں فکر ابن تیمیہ سے متاثر افراد کے شبہات کا ازالہ کر دیا ہے۔ ان کا انداز بیان بھی خوب ہے اور تحقیق بھی خوب ہے۔ ان کا مقام علم بالاتفاق ان لوگوں کے شیوخ المشائخ سے بھی درجوں بلند ہے۔

اصحاب قبور میں قوت سماعت قوت ادراک پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے کی خاصی تفصیل محدث عبدالحیٰ لکھنوی نے "تذکرۃ الراشد" میں رقم کی ہے۔

رہی یہ روایت "وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" محققین کے نزدیک اس آیت میں اصحاب قبور سے مراد مشرکین ہیں...... اس مقام پر بعض دیگر تحقیقات بھی ہیں، لہذا کسی کو کسی طرح کے مغالطے میں نہ آنا چاہیے۔

مذکورہ آیات واحادیث سے بالکل روشن ہوگیا کہ انبیاء، اولیاء اور صلحاء کے وسیلہ کا انکار کرنے والوں کے پاس کوئی معمولی دلیل بھی نہیں اور وسیلہ کو جائز ماننے والے اہل ایمان کو مشرک گردانا گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

رہے بعض عوام جو توسل وزیارت کے آداب کما حقہ ملحوظ نہیں رکھتے، ایسوں کے لئے اہل علم پر فرض ہے کہ ان کو متانت وسنجیدگی سے سمجھائیں۔ صدیوں سے امت توسل وزیارت پر کاربند رہی۔ اس کے انکار کی بدعت ابن تیمیہ حرانی نے پھیلائی۔ اس وقت کے علماء نے اس بدعت کا قلع قمع کر دیا تھا، اس پر بھرپور نکیر کی اور متعدد تحقیقی رد بھی لکھے...... لیکن ابن تیمیہ کی بلاؤں سے بے خبر اس سے متاثر افراد میں آج بھی یہ فتنہ پایا جا رہا ہے......

خیر الخلق محمد رسول اللہ ﷺ سے وسیلہ لینے میں امت مسلمہ کا دستور کیا رہا ہے، اس کی تفصیل کے لئے امام ابوعبداللہ بن نعمان محمد بن موسیٰ تلمسانی مالکی متوفی ۶۸۳ھ کی کتاب "مِصْبَاحُ الظَّلَامِ فِی الْمُسْتَغِیْثِیْنَ بِخَیْرِ الْاَنَامِ" کا مطالعہ کیا جائے...... یہ کتاب "دارالکتب المصریہ" کے نوادرات سے ہے۔

یہ تحریر انصاف پسندوں کے لئے کافی ہے۔

جمعیت اشاعت اہلسنّت پاکستان کی سرگرمیاں

ہفت واری اجتماع:۔

جمعیت اشاعت اہلسنّت پاکستان کے زیر اہتمام ہر پیر کو بعد نماز عشاء تقریباً ۱۰ بجے رات کو نور مسجد کاغذی بازار کراچی میں ایک اجتماع منعقد ہوتا ہے جس سے مقتدر ومختلف علمائے اہلسنّت مختلف موضوعات پر خطاب فرماتے ہیں۔

مفت سلسلہ اشاعت:۔

جمعیت کے تحت ایک مفت اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہے جس کے تحت ہر ماہ مقتدر علمائے اہلسنّت کی کتابیں مفت شائع کر کے تقسیم کی جاتی ہیں۔ خواہش مند حضرات نور مسجد سے رابطہ کریں۔

مدارس حفظ وناظرہ:۔

جمعیت کے تحت رات کو حفظ وناظرہ کے مختلف مدارس لگائے جاتے ہیں جہاں قرآن پاک حفظ وناظرہ کی مفت تعلیم دی جاتی ہے۔

درس نظامی:۔

جمعیت اشاعت اہلسنّت پاکستان کے تحت رات کے اوقات میں درس نظامی کی کلاسیں بھی لگائی جاتی ہیں جس میں ابتدائی پانچ درجوں کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

کتب وکیسٹ لائبریری:۔

جمعیت کے تحت ایک لائبریری بھی قائم ہے جس میں مختلف علمائے اہلسنّت کی کتابیں مطالعہ کے لیے اور کیسٹیں سماعت کے لیے مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ خواہش مند حضرات رابطہ فرمائیں۔

پیغام اعلیٰ حضرت

امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمتہ اللہ علیہ

پیارے بھائیو! تم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھولی بھالی بھیڑیں ہو بھیڑیئے تمہارے چاروں طرف ہیں یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بہکا دیں تمہیں فتنے میں ڈال دیں تمہیں اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں ان سے بچو اور دور بھاگو دیوبندی ہوئے ، رافضی ہوئے ، نیچری ہوئے ، قادیانی ہوئے ، چکڑالوی ہوئے ، غرض کتنے ہی فتنے ہوئے اور ان سب سے نئے گاندھوی ہوئے جنہوں نے ان سب کو اپنے اندر لے لیا یہ سب بھیڑیئے ہیں تمہارے ایمان کی تاک میں ہیں ان کے حملوں سے اپنا ایمان بچاؤ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ، رب العزت جل جلالہ کے نور ہیں حضور سے صحابہ روشن ہوئے ، ان سے تابعین روشن ہوئے ، تابعین سے تبع تابعین روشن ہوئے ، ان سے ائمہ مجتہدین روشن ہوئے ان سے ہم روشن ہوئے اب ہم تم سے کہتے ہیں یہ نور ہم سے لے لو ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ تم ہم سے روشن ہو وہ نور یہ ہے کہ اللہ ورسول کی سچی محبت ان کی تعظیم اور ان کے دوستوں کی خدمت اور ان کی تکریم اور ان کے دشمنوں سے سچی عداوت جس سے خدا اور رسول کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ پھر وہ تمہارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو فوراً اس سے جدا ہو جاؤ جس کو بارگاہِ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو ، اپنے اندر سے اسے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔

(وصایا شریف ص ۱۳ از مولانا حسنین رضا)